قرآن
مسلمان
اور
سائنس
ڈاکٹر محمد اسلم پرویز
اسلامک فاؤنڈیشن
برائے سائنس و ماحولیات
IFSE
ISLAMIC FOUNDATION FOR SCIENCE & ENVIRONMENT
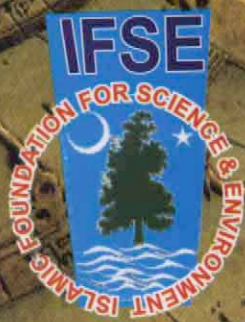
قرآن
مسلمان
اور سائنس

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

اشاعت اوّل : اپریل 2004ء

اشاعت دوم : جون 2004ء

اشاعت سوم : اپریل 2007ء

تعداد : ایک ہزار

ناشر : اسلامک فاؤنڈیشن برائے سائنس و ماحولیات

کمپوزنگ : کفیل احمد (موبائل:9871464966)

سرورق : جاوید اشرف

طباعت : ناز آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، چوڑی والان، دہلی۔6

قیمت : 80 روپے، 15 ریال/ درہم، 6 ڈالر، 5 یورو، 3 پونڈ

تقسیم کار : اسلامک فاؤنڈیشن برائے سائنس و ماحولیات
665/12 ذاکر نگر، نئی دہلی۔110025

QURAN MUSALMAN AUR SCIENCE
By
Dr. Mohammad Aslam Parvaiz

Publisher & Distributor
Islamic Foundation for Science & Environment
666/12, Zakir Nagar, New Delhi-110025
E-mail: parvaiz@ndf.vsnl.net.in

ترتیب

تاثّرات

ایک تاریخ ساز مہم

سیّد حامد
چانسلر جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

لسان الغیب حافظ شیراز کا ایک مطلع اچانک غُبار چھٹ جانے، اندھیرا دور ہوجانے اور دل پر سے ناگہاں بوجھ اُتر جانے کا اعلان کرتا ہے:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
واندران ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

(رات ڈھل چکی تھی، سحر طلوع ہونے والی تھی کہ وہ غبار، وغصہ، وہ اندھیرا جس نے مجھے ایک مدت سے گھیر رکھا تھا، ناگاہ دور ہوگیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے آبِ حیات بخشا گیا۔)

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے مضمون ''وہ صبح کبھی تو آئے گی'' میں وہی کیفیت ہے جو حافظ کی مذکورہ غزل کو ممتاز کرتی ہے۔ قاری کو ایسے وجود کا احساس ہوتا ہے جس نے اللہ کی آیات کا مطالعہ استغراق کی حد تک کیا ہے۔ دونوں طرح کی آیات کا۔ وہ آیات یا نشانیاں جو قرآنِ پاک میں ملفوظ ہیں اور وہ آیات یا نشانیاں بھی جو کائنات میں منتشر ہیں۔ دونوں غور وفکر کی طالب ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے میں معاون، ایک

دوسرے کو سمجھے بغیر دونوں کا فہم ادھورا رہتا ہے۔ پورے مضمون میں ایک جذب کی کیفیت ہے۔'' میرے سامنے سورۃ العنکبوت ہے اور نگاہ جس آیت پر ٹھہرتی ہے وہ میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّا سِ ج یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش
وَمَا یَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ کرتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے
(العنکبوت:43) ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔

فاضل مصنف کی ذات میں کائنات کا مشاہدہ اور قرآنِ کریم کا تدبّر کے ساتھ مطالعہ دونوں جمع ہوگئے ہیں۔ وہ ایک ماہر نباتیات ہے اس کا علم ہر ہر قدم پر وجودِ باری تعالیٰ اور مشیّتِ الٰہی کی شہادتیں فراہم کرتا ہے۔ پیڑوں کو ہی لیجئے۔''یہ درخت ایک ننھے سے سماج کی مانند کام کرتا ہے جس میں ہر فرد کی ذمہ داری طے ہے...... پودے کی سبز پتیوں میں غذا سازی اور غذائی تقسیم کا عمل قابل غور ہے''۔ سعدیؒ نے کہا تھا:

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتر یست معرفت کردگار

(اس شخص کے لیے جو ہوش وگوش رکھتا ہے، جو صاحب علم ہے، پیڑ کا ہر پتہ خالق کو پہچاننے کے لیے ایک صحیفہ کا کام کرتا ہے)۔

''کتابِ عالم'' کی اصطلاح نے، جو مصنّف نے وضع کی ہے اور جو سرنامہ ہے اس زرّیں سلسلۂ مضامین کا، دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ کائنات ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر ذی ہوش پڑھ سکتا ہے اور جو پکار پکار کر اپنے مصنّف یا خالق کی حکمت کا اعلان کررہی ہے۔ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اُسی خالق ہر دوسرا، اسی مصنّف بے ہمتا کی دوسری کتاب ، قرآن سے مدد اور رہنمائی ملتی ہے، کہیں صراحت کے ساتھ کہیں اشاروں میں۔ یہ کائنات پر، کائنات کے ہر گوشے پر اور کائنات میں جو عمل پیہم جاری

وساری ہیں ان پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔اور توجہ اس نظام اکبر کی طرف منعطف کرتی ہے جو زندگی بخش ہے اور جس میں خود کو زندہ رکھنے کی طاقت ہے، جس کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے وردِ زبان ہے کہ ہمیں بے کار اور بے سُود نہیں بنایا گیا، ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دائرۂ کار مقرر ہے، اس میں رہ کر ہم اپنے وظیفۂ زندگی کو انجام دیتے ہیں، اپنے مقصدِ حیات کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر نظام، ہر دائرہ کار، ہر عمل، ہر سکون، ہر حرکت، کائنات کے سلسلۂ ذہب کی ایک کڑی ہے، اس عالمگیر، اس آفاق پیکر مشینری کا ہر پرزہ کارآمد اور مصروفِ کار ہے۔ ہر دانائے راز جانتا ہے کہ ایسا پیچیدہ نظامِ حیات جس میں اربوں کارکن لگے ہوئے ہیں خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔ نہ ایک لمحہ بغیر کارفرما کی مواطب التفات کے قائم اور گرم کار رہ سکتا ہے۔
مصنّف نے کائنات کبیر اور کائنات صغیر یعنی انسان، کے مشاہدہ، معائنہ اور مطالعہ سے یہ سبق حاصل کیا ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان سے بھی (جو اشرف المخلوقات ہے) یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کائنات کے دوسرے اعضاء کی طرح مقصدِ کائنات کا اتباع کرے گا اور قدرت کے منشور کے مطابق اپنے اعمال وحرکات کو ڈھالے گا۔ شیخ شیرازیؒ کی دور بیں اور قلزم شگاف نگاہ نے آج سے لگ بھگ آٹھ سو سال پہلے اس رمز کو پالیا تھا:

ابر وباد ومہ و خورشید وفلک درکارند
تاتونانے بکف آری وبہ غفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتۂ وفرماں بردار
شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

(بادل اور ہوا، چاند اور سورج اور آسمان رات دن محنت کررہے ہیں، تاکہ اے انسان تو غذا حاصل کرسکے اور اسے غفلت میں نہ کھائے۔ غور تو کر یہ سب تیری خاطر احکام کی تعمیل کررہے ہیں اور دیوانہ وار سرگرم عمل ہیں، کیا تجھے یہ بات زیب دیتی ہے

کہ تو حکم نہ بجالائے)

حکم نہ بجالانا سے مراد نوامیس فطرت سے بے التفاتی اور قوانینِ فطرت سے سرتابی ہے۔ انسان نے اُس اعتدال اور توازن اور عدمِ اسراف اور انصاف اور عادلانہ تقسیم کو ترک کردیا افلاک کا خیمہ جس پر ایستادہ ہے۔ اس نے ایک پاکیزہ ماحول کو اپنی خودغرضی ناانصافی اور فضول خرچی سے آلودہ اور مسموم کردیا۔ اس نے فطرت کے اس قانون کو کہ ضرورت سے زیادہ ہر شئے کو آگے بڑھا دیا جائے، بانٹ لیا جائے بڑی بے دردی سے توڑ دیا۔ انسانیت آج ان انحرافات کے نتائج بھگت رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے قرآن کریم کے مطالعہ اور علوم میں دستگاہ کی بدولت آفاقی اخلاقیات کی تشکیل کی ہے۔ تاکہ انسان کائنات کے ہمہ گیر نظام توازن اور ارتباط سے انحراف نہ کرسکے۔ اور اگر کرے تو اس کے نتائج کی آہٹ اس کے ضمیر کو ضرور مل جائے۔

طرز بیان میں ژولیدگی یا الجھاؤ تبھی تک رہتا ہے جب تک انسان کو اپنے مضمون پر قدرت نہ حاصل ہوجائے۔ جہاں یہ قدرت ہاتھ آئی پیرایہ اظہار میں سادگی آجاتی ہے چنانچہ قارئین دیکھیں گے کہ ہمارے مصنّف کا طرزِ بیان سادہ، شگفتہ، سلجھا ہوا اور دلنشین ہونے والا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنّف اس دلفریب اور حیرت انگیز ڈرامے کو اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے جو کائنات کی وسیع اسٹیج پر دن رات کھیلا جارہا ہے۔ اجرام فلک، جمادات ونباتات ایکٹر بن کر اسٹیج پر آتے ہیں اور اپنا رول ادا کرکے چلے جاتے ہیں۔

اس چشم کشا مضمون کی تان اس اخلاقی درس پر ٹوٹتی ہے ''کوئی بھی پتّی اپنی تیار شدہ شکر کو اپنے پاس بچا کر نہیں رکھتی، پس انداز نہیں کرتی بلکہ محض اپنی ضرورت لائق شکر استعمال کرکے باقیماندہ شکر کو اوّلاً ان علاقوں کی طرف روانہ کرتی ہے جو شکر نہیں بناتے''۔ یہ ایک سائنسی کلّیہ ہے کہ ''ہر مادّہ اپنی زیادہ مقدار والی جگہ سے کم مقدار والی

جگہ کی طرف منتقل ہوتا ہے''۔ وہ افراد اور قومیں جو ضرورت سے زیادہ صَرف یا جمع کرتے ہیں ان سے اس کلّیہ کی خلاف ورزی سرزد ہوتی ہے۔ یہ خلاف ورزی ایک طرف سماج دوسری طرف اقوامِ عالم اور کائنات میں فساد کا باعث ہوتی ہے۔ ہر فتنہ اسی بدعت سے سر اٹھاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں پیلی دھات جیتے جاگتے انسانوں کا خون چوستی ہے، چنانچہ زرِ سیّال کی امریکی ہوس نے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کو تباہ کررکھا ہے۔ سونے کا جادو ایسا چلا ہے کہ گوتم اور گاندھی کے ملک نے بھی سرمایہ داری کو گلے لگالیا ہے۔ گلوبلائزیشن نے باقی دنیا کی طرح ہندوستان کو بھی اپنی آہنی گرفت میں لے لیا ہے۔ دولت چند ہاتھوں میں اکٹھا ہوگئی ہے۔ آرام اور سکون سے انسان محروم ہوتے جارہے ہیں؛ غریب اکثریت ناداری کی وجہ سے، زردار اقلیت ہوس کے فشار سے۔ یہ سارا فتنہ وفساد آئینِ فطرت سے اس انحراف کی وجہ سے رونما ہوا ہے جو وسائل کی غیرمنصفانہ تقسیم کے لیے ذمہ دار ہے۔

مصنّف مبلّغ بھی ہے اور ایک تحریک کا بانی بھی۔ اس کا رسالہ ''سائنس'' جس نے عمر کے دس سال پورے کرلیے عہد ساز ثابت ہورہا ہے۔ شروع میں اس کا مقصد تھا اردو والوں کو علوم یا سائنس سے آشنا کرنا، سائنسی مضامین پر لکھنے والے پیدا کرنا اور انھیں پڑھنے والوں کی تعداد بڑھانا۔ سائنس کے نکات کو سادہ اور عام فہم زبان میں بیان کرنا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ سب کام اس رسالے نے بخوبی انجام دیئے اور دے رہا ہے۔ لیکن حال حال میں اس نے اپنے دائرہ کار کو وسیع کرکے اسے آفاقی رنگ وآہنگ اور کائناتی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کی ٹھانی ہے۔ یہ کام بھی انشاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور اس حقیقت کو جس کی طرف ہمارے یہاں پہلے پہل سیّد احمد خاں کا ذہن گیا تھا کہ قرآن اللہ کا قول ہے اور کائنات اس کا فعل، اور جس کی شرح فاضل مصنّف نے عام فہم اور دلنشین انداز سے کی ہے، دیر یا سویر دنیا مان کر رہے گی۔

یہ بات بھی امید افزا ہے کہ رسالہ ''سائنس'' کی دسترس مدارس تک ہو رہی ہے۔ اکنافِ عالم اور تسخیر آفاق سے مسلمانوں کی کنارہ کشی اور پسپائی کی بڑی وجہ قرآن سے رُوگردانی ہے۔ گھروں کا یہ عالم ہے کہ قرآن کو بعنایت احترام کے جزدان میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں میں رکھ دیا گیا ہے، مدارس کے نصاب نے اس کی طرف سے غفلت برتی ہے۔ عصری تعلیمی اداروں میں سے جن میں دینیات پڑھائی جاتی ہے توجہ بالعموم مسلکوں مسائل تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ اس طرح نظام تعلیم میں قرآن کو جب سے چھوڑا اقبال اور اقتدار نے ان سے منہ موڑ لیا۔ سائنس کو قرآن کا جب سے دشمن سمجھا گیا مسلمان جہل کی تاریکی میں چلے گئے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی سائنس کی اشاعت و ترویج کی مہم بالواسطہ قرآن کی طرف واپسی کی تحریک بھی ہے۔ اللہ ان کے ذہن اور دماغ اور دستِ و بازو کو وہ توانائی دے جو اس مہم کے لیے درکار ہے۔

اس مہم اور اس کے پردہ بر انداز ان اثرات کو گھر گھر پہنچانا ہوگا تاکہ صدیوں سے آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹ جائیں۔ اس حسنِ احتیاط کی داد دینا پڑے گی کہ مصنّف نے قرآن کریم سے غفلت کے تباہ کن نتائج کے ادراک کے باوجود ملّت کے مختلف طبقات کا احترام کرتے ہوئے اس غفلت کے لیے کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ جس حیات بخش تحریک کو وہ لے کر اٹھا ہے اس میں کسی قسم کا اختلاف رونما ہو۔

مصنّف نے چھوٹی سی مدّت میں کئی کام کر دکھائے ہیں یا ان کی نیو ڈال دی ہے۔ اس تفصیل کا اجمال یہ ہے:

1۔ اپنے رسالہ ''سائنس'' کے ذریعہ اس نے سائنس کو آسان بنا دیا ہے اور اردو داں طبقے میں اس کے ذوق کو عام کرنے کے جتن کیے ہیں۔ سائنسی نقطۂ نظر کی ترویج کی سمت میں اس نے قدم بڑھائے ہیں اور سائنس پر عام فہم انداز میں لکھنے

والوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا ہے۔

2۔ اس نے دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کی ہے کہ قرآن کا ادراک اور سائنس کا فہم یکجا ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ دونوں کو ایک دوسرے سے کمک ملتی ہے۔

3۔ اس نے اس روش سے کھل کر اختلاف کیا ہے، براہین قاطع کے ساتھ، کہ سائنس قرآن کی حقانیت کو ثابت کرتی ہے۔ قرآن اس نوع کے عارضی اور وقتی سہارے سے بے نیاز اور بالاتر ہے۔

4۔ اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حصولِ علم کو انسان سازی پر مامور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ علوم کا رشتہ قرآن کریم کے ساتھ جوڑا جائے۔ تحصیل علوم کو ایک سطحی اکتساب اور کسب معاش کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو مشیت الٰہی کے رموز سمجھنے کا وسیلہ اور نظام کائنات کا ایک عضو مانا جائے۔ علم یا آگاہی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے (Islamisation of Knowledge) کی جو مہم امریکہ سے شروع ہوئی تھی اور عالم اسلام میں پھیل چکی ہے، اس کی تفصیلات سے راقم السطور واقف نہیں ہے لیکن مہم کے عنوان کو دیکھتے ہوئے یہ خیال بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جس انداز سے محمد اسلم پرویز نے علوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا ہے اس میں ''اسلمائزیشن'' کی تحریک سے زیادہ گہرائی اور حسن قبول ہے۔

5۔ مصنّف نے ایک عنوان اس علم کی نیو ڈالی ہے جسے راقم السطور نے آفاقی اخلاقیات کا نام دیا ہے۔ نظام حیات یا توازن عناصر کو صنعتی اور ٹکنولوجیکل انقلاب کے تحت انسان نے نادانستہ بدلا ہے۔ اس میں فتنہ و فساد کی راہیں کھول دی ہیں۔ جیسے یہ کافی نہ ہو، اب وہ جان بوجھ کر یعنی اس توازن کو تجربہ اور تجسس کے نشے میں جینٹک انجینئرنگ ''کلوننگ'' اور ڈی این اے کی ''ری اسٹرکچرنگ'' کے ذریعہ بدلنے کی دانستہ کوششیں کر رہا ہے۔ غافل اس سے کہ بالآخر مستقبل بعید میں یہ

تجربات کس قدر بڑھیں گے، کتنے تباہ کن ہوں گے۔

مصنّف نے ایک بہت بڑی، نتیجہ خیز اور عہد آفریں تحریک کی شروعات کی ہے۔ اسے بڑے پیمانے پر مالی، فکری اور افرادی وسائل کی ضرورت ہوگی۔ کیا اسے یہ وسائل دستیاب ہوجائیں گے؟ اس کے دل میں جو تڑپ ہے، اس میں بات کو سلیقہ اور تاثیر کے ساتھ کہنے اور لکھنے کی جو صلاحیت ہے، اس کے اندر جو اخلاص ہے، جوشِ وخروش اور حوصلہ ہے۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی بات کبھی صدا بہ صحرا نہیں ہوگی۔ پودے کی جڑ کی پانی کی تلاش کی بابت جو مصنف نے کہا ہے وہ خود اس پر صادق آتا ہے۔ ''ننھی سی جان راستے میں آنے والے کنکر پتھروں کی پروا نہیں کرتی۔ تاہم وہ ان سے الجھتی بھی نہیں، انھیں توڑتی بھی نہیں، بلکہ دائیں بائیں سے راستہ بناتی ہوئی اپنا سفر جاری رکھتی ہے حتیٰ کہ پانی سے جاملتی ہے''۔ یہ پانی کیا ہے؟ آبِ حیات، دوامی زندگی کا ضامن۔

3/مارچ 2004ء

لائقِ قدر کوشش

مکرمی ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب زیدلطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی تصنیف ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' مجھے موصول ہوئی، آپ نے قرآن مجید کی آیات والفاظ سے علم کے سلسلہ میں جو تشریحات پیش کی ہیں اور اس کائنات کی جزئیات اور تفصیلات کا ان سے جو انطباق کیا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم کی صلاحیت عطا کی گئی ہے، اس کو خلافۃ اللہ فی الارض سے مربوط کرتے ہوئے اس کو عملی دائرہ میں لاتے ہوئے اس کی اہمیت ظاہر کی ہے اور اس کے ذریعے انسان کی تجرباتی اور معلوماتی زندگی میں جو اہمیت اور ضرورت بتائی ہے، وہ بڑی لائق قدر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے پروردگار کی طرف سے دی ہوئی علمی صلاحیت کو سمجھے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو وہ دنیا میں غلبہ وعظمت کے مقام حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علمی صلاحیت کے ذریعہ وہ تمام چیزیں معلوم کی جاسکتی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کے فائدہ اور سہولت کے لیے زمین اور فضا میں رکھی ہیں، اور انسان کی ضرورت کے لائق بتائی ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی انسان کے لیے قابل عمل بنادیا ہے، اور نیک مقصد رکھنے والے انسان اور خودغرضانہ مقاصد رکھنے والے انسان دونوں کے لیے ان سے استفادہ کی سہولت رکھی ہے، لیکن مسلمان اور غیر مسلمان

کے درمیان فرق بھی بتایا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کو اپنے پروردگار کی مرضی کے مطابق ان
سے فائدہ اٹھانا ہے، اور اس پر اس کے لیے آخرت میں جزا وثواب مقرر فرمایا ہے۔ اور
نافرمان بندوں کے لیے جو ان نعمتوں پر اپنے رب کے شکر گزار نہیں اور اپنے رب کی
مرضی کے تابعدار نہیں، ان کے لیے یہ سہولت ونعمت قابل استفادہ تو رکھی ہے لیکن ان کی
ناشکری اور نافرمانی پر پکڑ اور سزا بھی رکھی ہے۔ جس سے ان کو آخرت میں سابقہ پڑے
گا۔ اس طرح اس علمی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم اور مرضی اور ہدایت کے مطابق
اختیار کرنے کے ساتھ مربوط کردیا ہے۔

آپ نے قرآن مجید کی آیات سے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا علم حاصل کیے جانے
کی ضرورت واہمیت کو بڑے سہل اور رواں اسلوب میں ادا کیا ہے، جس کو پڑھ کر ان
اسرار کون ومکان کو سمجھنے میں اس کتاب کے ہر مطالعہ کرنے والے کو مدد ملے گی، آپ کی
اس کتاب سے قبل کئی فاضل حضرات نے اسی دائرے میں کوششیں کیں مثلاً لبنان کے
ایک بڑے فاضل شیخ ندیم الجسر نے عربی میں اسی طرح کی تحقیقات پر معرکۃ الآراء
کتاب لکھی ہے اور ابھی تازہ تازہ ایک کتاب ڈاکٹر محمد انس ندوی کی بھی شائع ہوئی
ہے۔ امید ہے کہ آپ کی اس پر نظر پڑی ہوگی۔ بہرحال آپ کا کام وقیع اور قابل قدر
ہے اور سائنس کا رسالہ جو آپ شائع کررہے ہیں علم کی بڑی خدمت ہے، میں اس پر بھی
اپنی قدردانی کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کاموں کو مفید بنائے اور مسلمانوں کو
ان سے دین ودنیا کے فہم میں مدد ملے۔

محمد رابع حسنی ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

21/ربیع الاول 25ھ

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا مشن
وحی الٰہی کی صداقت کا اظہار وانکشاف ہے

اپنی اپنی نظر ہے، میری نظر میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کو خداتعالیٰ نے اپنی آخری وحی
(قرآن حکیم) کی صداقت کو جدید ذہن وفہم کے اندر داخل کرنے کے لیے کھڑا کیا ہے۔
علماءِ تفسیر قرآن میں حضرت امام شاہ ولی اللہ وہ پہلے مفسر وشارح ہیں جنھوں نے علم
وحکمت ومصلحت کو اپنی مصلحانہ اور مجددانہ تحریک کی بنیاد قرار دے کر علوم شریعت اسلامی کی
دعوت دی اور شاہ صاحب کے بعد وہ پہلی شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے جنھوں نے
قرآن کریم کی تفسیر (ترجمان القرآن) میں قرآن کی اس بنیادی صداقت کو واضح کیا کہ
"قرآنِ کریم تاریخ مذاہب کی وہ پہلی کتاب ہے جس نے خدا کی صفات وافعال
کے لیے عقلی تصور قائم کیا اور اس حقیقت کو واضح کیا کہ حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت خدا
تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حاکمیت مطلقہ کے خلاف نہیں"۔

قرآن کریم نے دین حق (اسلام) کو دین فطرت قرار دیا (سورہ روم :30)
جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، فطرتِ
انسانی کی تردید اور تنسیخ نہیں کرتا، فطرت کے تقاضوں کو دباتا نہیں، کچلتا نہیں، بلکہ ان
تقاضوں اور ان احساسات وجذبات کو شان انسانیت کے مطابق پورا کرنے میں ان کی
بھرپور مدد کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ہمیں کائنات عالم کے فطری کمالات، فطری محاسن، فطری اوصاف کا مشاہدہ کراتا ہے اور ہمارے دل و دماغ کے اندر قرآنی افکار، قرآنی اعمال اور شرعی عبادات کی صداقت کی روشنی پیدا کرنے کا فرض انجام دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ہمیں دور اور بہت دو خلاؤں اور فضاؤں کا مشاہدہ بھی کراتا ہے اور ہمیں اپنے پاس اور سامنے کی چیزیں بھی دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ”یہ درخت ایک ننھے سے سماج کی مانند کام کرتا ہے جس میں ہر فرد کی ذمہ داری طے ہے، پودے کی سبز پتیوں میں غذا سازی اور غذائی تقسیم کا عمل قابل غور ہے۔ شیخ سعدی نے یہ سبق تو دیا ہے:

ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

قرآن کریم نے عدل اعتدال، میانہ روی، انصاف پروری، بیچ کی چال اور انتہا پسندی اور شدت پسندی سے احتراز کی مسلسل دعوت دی ہے۔ اور آخری اُمّت (اُمّت مسلمہ) کو اُمت وسط (اعتدال پر قائم) ملّت کے لقب سے پکارا ہے۔

ڈاکٹر اسلم قرآن کریم کے اس اصول صداقت کا نظام فطرت میں مشاہدہ کراتا ہے اور لکھتا ہے:

”کوئی بھی پتّی اپنی تیارشدہ شکر کو اپنے پاس بچا کر نہیں رکھتی پس انداز نہیں کرتی بلکہ محض اپنی ضرورت کے لائق شکر استعمال کر کے باقی ماندہ کو دوسرے علاقوں کی طرف روانہ کر دیتی ہے۔ (جو شکر نہیں بناتے)

یہ ایک سائنسی کلیّہ ہے ”ہر مادّہ اپنی زیادہ مقدار والی جگہ سے کم مقدار والی جگہ کی طرف منتقل ہوتا ہے“۔

ڈاکٹر اسلم کا مزاج اوران کے مزاج کی طرح ان کا قلم احترام پسند واقع ہوا ہے، وہ اپنے اس مشن ومقصد کی صداقت کے زعم میں تلخ گوئی اور ترش روئی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

بڑی بڑی اسلامی تحریکیں اسی لیے ناکام ہوئیں کہ ان کے داعی اور محرک حضرات

کے اندر تحریک کے ساتھ عقیدت غلو اور شدت پسندی میں آلودہ ہوگئی اور پھر اس غلو پسندی کا نام ”جرأت حق“ قرار دیا گیا اور جو سنجیدہ مزاج، عاقبت اندیش اور فہم عمیق اور عقل سلیم والے وعلماء صلحاء تھے انھیں محروم جرأت وخالی از تجدید کہا گیا۔

یہ انجام واندیشہ ڈاکٹر اسلم کے سامنے ہے۔ یہ بڑا نازک دور ہے۔ جدید علوم کی صلاحیت اور جدید اسلوب تحریر وتقریر کا ملکہ ہمارے سامنے فتنہ بن کر آرہا ہے، اسلم صاحب کو اس سے محفوظ رہنے کی دعا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر اسلم اس تحریک (مشاہدہ، عقل وفکر سے کام لینا) کے بانی اور موجد نہیں ہیں۔ خدا کرے ان کے اندر یہ خوش فہمی پیدا نہ ہو۔ بلکہ وہ امام شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک حکمت ومصلحت کے داعی ہیں۔ مبلّغ ہیں اور اپنے جدید علم اور خداداد صلاحیت واشتیاق کی بدولت اپنے مشن کو لے کر جدوجہد کر رہے ہیں۔

مشن ومقصد سے قطع نظر ڈاکٹر اسلم سخت جفاکشی، تندہی اور سچی لگن کا نام ہے۔ جس پر علامہ اقبال نے کہا ہے:

ہے یاد تجھے نکتہ سلمانِ خوش آہنگ — دنیا نہیں مردان جفاکش کے لیے تنگ
چیتے کا جگر چاہئے شاہین کا تجسس — جی سکتے ہیں بے روشنی دانش افرنگ
کر بلبل وطاؤس کی تقلید سے توبہ — بلبل فقط آواز ہے طاؤس محض رنگ

خدا تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو ان کے مشن میں کامیابی عطا کرے اور ان کے مشن کا ترجمان ”ماہنامہ سائنس“ ملک وملت میں قبول عام حاصل کرے۔

11/اپریل2004ء

اخلاق حسین قاسمی
ادارہ رحمت عالم، لال کنواں دہلی

ایک تاثّر

جناب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب ایک ماہر محقق اور زندگی وکائنات کو اپنے عمیق مطالعہ کی روشنی میں ایک دوسرے کو توازن کے ساتھ جوڑنے کی سعی میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ مسلمان کا اس کائنات کی تعمیر میں کیا کردار ہے، اور کتاب وسنّت کی تعلیمات کے مطابق وہ کائنات کا بغور مطالعہ کرنے سے زندگی کو کیا فائدہ پہنچاتا ہے اور قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق آفاق وانفس میں غور کرکے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں کو دیکھ کر کس طرح اپنی کھلی آنکھوں سے حق کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اس کے نتائج کتنے دوررس ہوتے ہیں۔

ان تمام حقیقتوں کو انھوں نے اپنی اس مفید کتاب میں علمی دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے، وہ قرآن کریم کو سرچشمہ علم وحیات قرار دے کر انسان کی ہدایت اور اس کی فکر سلیم کو مہمیز کرکے کائنات کی آیات میں غور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اس کتاب علم وہدایت کی روشنی میں علوم وفنون کی تدوین کی تھی اور زندگی کے گوشوں کو منور کیا تھا۔ اس وقت یورپ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا، اور جہالت وبربریت کی تاریکیوں میں پورا یورپ بھٹک رہا تھا۔ یہ دسویں صدی کا زمانہ تھا، جب مسلمان علوم وفنون کے ہتھیار سے لیس ہوکر یورپ پہنچے اور اندلس میں قیام کرکے اس سوئی ہوئی قوم کو جھنجھوڑا اور اسے زندگی کے آداب سے آشنا

کیا، علوم وفنون کا تحفہ عطا کیا، اور تہذیب وتمدن کا گُر سکھایا۔ پھر یورپ بیدار ہوا، اور اس نے مسلمانوں کے اس عظیم احسان کو آہستہ آہستہ بھلانا شروع کردیا، اور آخر میں اس نے اپنے محسنوں کو استعمار واستبداد کے پنجوں میں جکڑنا شروع کردیا، اور 18ویں صدی عیسوی میں فاتحانہ اور قائدانہ انداز کے ساتھ مسلمانوں کے ملکوں میں داخل ہوگیا، اور سب کو اس نے غلامی کا طوق پہنادیا اور خود ''محسن اعظم'' کی شکل اختیار کرلی۔

افسوس کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کیا، اور وہ پوری اطاعت کے ساتھ اس محسن کش قوم کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔

موجودہ کتاب میں مسلمانوں کے اس قرآنی امتیاز کو علم کی روشنی میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور قرآن کریم کے ساتھ علم کے عظیم تعلق کو دلائل کے ساتھ پیش کرکے ایک بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوکر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس امانت کے اصل حامل اور اس کے حقدار مسلمان اور صرف مسلمان ہیں۔

راقم الحروف

سعید الرحمٰن الاعظمی الندوی

مہتمم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، مدیر البعث الاسلامی

ایک کلیم سربہ کف

علیم وخبیر رب کائنات کی اس دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ہر برائی اور خرابی اپنے نقطۂ عروج پر تھی، کفر وشرک ، بت پرستی ،ظلم وجور، بے حیائی، شراب، قمار بازی، اونچ نیچ اور عدم مساوات۔غرض ہرخرابی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ صرف اسی برائی سے اس زمانے کومنسوب کیا جاسکتا تھا۔مگر زمانوں کے پیدا کرنے والے علیم وخبیر رب نے اپنے رسولؐ کی بعثت سے قبل کے زمانے کو کفر وشرک ، بت پرستی،ظلم ، بے حیائی اور شراب وغیرہ سے منسوب کرنے کے بجائے زمانۂ جاہلیت سے منسوب کیا اور جہالت سے منسوب اس دورِ جہالت کے خاتمے کے لیے غار حرا سے اسلامی اور علمی انقلاب برپا کرنے کے لیے قانون کو نازل کیا۔ چھ سوسال بعد آسمان کا دروازہ کھلا اور بھٹکی ہوئی انسانیت پر رحمت خداوندی متوجہ ہوئی۔ ان پڑھ اُمیّوں کے لیے نبی امّی پر وحی کا نزول شروع ہوا تو اس کی ابتداء ان انقلابی الفاظ سے ہوئی۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (العلق : 1 - 5)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا (پوری کائنات کو)۔انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو آپ کا رب سب سے زیادہ کرم والا ہے۔جس نے قلم سے تعلیم دی اور انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا“۔

اصل میں جاہلیت کی دنیا میں علمی،علمی دنیا میں سائنسی اور تحقیقی اور سائنسی اور تحقیقی دنیا میں ایمانی اور اسلامی انقلاب کے عنوان اور اصول کے طور پر یہ پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔جس میں تخلیق کائنات اور تخلیق انسانی کے تحریری یعنی قلمی اور تجرباتی علم کو اللہ کے نام سے جوڑنے اور اس کو اللہ کا بڑا کرم ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔کائنات کی ہر شئے اور زمین وآسمان کے تمام خزانوں کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات یعنی انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (الجاثیہ:12-13)

اللہ نے تمہارے لیے سمندر کو کام میں لگادیا۔اسی کے حکم سے دریا میں جہاز چلتے ہیں تاکہ تم اس کا فضل یعنی روزی تلاش کرسکو اور تم پر لازم ہے کہ شکر ادا کرو اور اسی نے آسمان وزمین کی سب کی سب چیزوں کو اپنے فضل سے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ بیشک اس میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

زمین وآسمان کی تسخیر اور یہاں کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان اشیاء اور نعمتوں کے مزاج ،خواص اور افادیت کا علم ضروری تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجنے سے قبل تمام اشیاء کے مزاج، خصوصیات اور تخلیقی خوبیوں اور باریکیوں سے باخبر کیا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا (سورہ البقرہ آیت 21) کائنات میں پھیلی ہوئی مخلوقات جن کو دینی اور قرآنی اصطلاح میں آیات فعلی کہا گیا ہے، کی خصوصیات اور تخلیقی خوبیوں کا علم ہی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی فضیلت کا معیار اور ان کو مسجود ملائک بنانے کی علّت قرار دیا۔آدم علیہ السلام کے بعد سارے

انبیاء ورسل، اللہ کی مرضی کے مطابق ان تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بتانے اورآدم علیہ السلام اوراس کی وراثت میں بنی نوع آدم کی فطرت میں ودیعت کیے گئے علم کا رشتہ اللہ کی اطاعت سے جوڑنے کے لیے آئے اوران پرکتابیں یعنی قولی آیات نازل ہوتی رہیں۔اور وہ اللہ کی فعلی آیات اوران پر تحقیقی علم کا رشتہ اس کی ان قولی آیات اور نازل کردہ قانون سے جوڑتے رہے۔ اخیر میں نبی خاتم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری انسانیت کے لیے مبعوث ہوئے۔ ان کے کام اورمقصد بعثت کے عنوان کے طور پر سورہ اعلیٰ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔گویا آپ کو جاہلیت کی دنیا میں ہونے والے علمی، سائنسی اور تحقیقی انقلاب کو اسم رب سے جوڑنے کے لیے مبعوث کیا گیا اس طرح رسول کامل اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے کے سلسلے میں نئے رونما ہونے والے سائنسی انقلاب کو اسم رب یعنی آیات قولی اورکتاب اللہ سے جوڑنا عنوان قرار پایا۔

انسان والہانہ طور پر عجز وانکسار اور حد درجہ خلوص خشیت کے ساتھ اس وقت ہی اللہ کے احکام کی پابندی اوراس کی بندگی کرسکتا ہے جب اسے اس کی شان اور اس کی جلالت ، کمالات اور صفات کی معرفت حاصل ہو۔حکیم وخبیر خالقِ انسان نے اس کی فطرت میں یہ خوبی رکھی ہے کہ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق اور مصنوع کو دیکھ کر اس کے صانع کی معرفت حاصل کرتا ہے۔آپ کوئی اچھا کھانا کھاتے ہیں تو فوراً آپ کا ذوق ووجدان آپ کومتوجہ کرتا ہے کہ یہ کھانا کس نے بنایا؟ کوئی اچھا سلا ہوا کپڑا دیکھتے ہیں تو فوراً اندر سے سوال اٹھتا ہے کہ یہ کپڑا کس نے سیا؟ کوئی اچھی تعمیر دیکھتے ہیں تو فوراً اس کی طلب ہوتی ہے کہ معلوم کریں یہ تعمیر کس نے کی؟ انسان کی فطرت اوراس کی سرشت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی رکھی

ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر وہ اس کے خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ جس قدر مخلوق میں تدبر کرتا ہے اسی قدر خالق کی معرفت وعظمت میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی بندگی کی بجاآوری میں کمال اورخشیت پیدا کرنے کے لیے اس کی معرفت ضروری اورلازمی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کتاب اللہ، آیات قولی میں تدبر کے ساتھ آیات فعلی یعنی مخلوقات میں تفکر ضروری ہے۔ اور ایمانی نقطہ نظر سے قولی اورفعلی دونوں ہی طرح کی آیات پر ایمان ، تدبر وتفکر لازمی ہے۔اوران میں کسی ایک کا بھی انکار کفر ہے۔جس طرح آیات قرآنی کے انکار کوقرآن نے کفر قرار دیا ہے اسی طرح آیات فعلی کے منکر کو بھی قرآن حکیم نے کافر کہا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝
(صٓ:27)

اور ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ ان کے بیچ ہے بےمقصد پیدا نہیں کیا ہے ایسا خیال تو ان لوگوں کا ہے جو حق کے انکاری ہیں۔ ایسے منکروں کو آگ میں جانے پر اپنی بدبختی کا وبال بھگتنا ہے۔

قرآن حکیم نے اہل عقل اوالوالالباب، دانشمند اور عالم انہی لوگوں کو کہا ہے جو کتاب اللہ کی آیات کی روشنی میں مخلوقات پر تفکر کریں۔قولی آیات پر تدبر اگر تفہیم قرآنی ہے تو فعلی آیات میں تفکر اورغور وخوض بھی ،جس کوعلمِ سائنس کہتے ہیں،قرآن کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ورنہ عنوان کے طور پر تخلیق کائنات اورانسان کوخون کے لوتھڑے سے پیدا کرنے کے ذکر سے وحی کا آغاز نہ ہوتا۔اس حقیقت کونظرانداز کرنے کی وجہ

سے اہل دین نے علوم سائنس کو علوم دنیا سمجھ کر نظر انداز کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں سائنسی تحقیقات وایجادات کا رشتہ اور ربط قرآن حکیم سے نہ جڑ پانے کی وجہ سے اس سے معرفت خداوندی اور تعلق مع اللہ حاصل کرنے کا کام نہ لیا جا سکا۔ قرآن حکیم نے خشیت کو علماء کی صفت کے طور پر ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ تَـرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْـزَلَ مِنَ السَّمَـآءِ مَـآءً ۚ فَاَخْـرَجْنَا بِهٖ ثَـمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَـا ؕ وَمِـنَ الْجِبَـالِ جُـدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُـمْـرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْـوَانُهَـا وَغَـرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَمِـنَ النَّاسِ وَالـدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَـامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ

(فاطر: 27-28)

کیا یہ منظر تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتار دیا۔ پھر ہماری یہ شان ہے کہ اس پانی سے ہم نے رنگ برنگے پھل فروٹ نکال دیئے۔ پہاڑوں میں بھی دھاری دار گھاٹیاں جن کے سرخ اور سفید رنگ کے علاوہ بھی اور بہت سے رنگ ہیں۔ اور کوئی تو ایسے کہ کالے بھجنگ یعنی بہت گہرے سیاہ۔ اسی طرح انسانوں اور زمین پر رینگنے والے اور چار پائے جانوروں کے بھی الگ الگ رنگ ہوا کرتے ہیں۔ (ایسی نشانیاں خوب غور کرنے کی ہیں) بس اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

یعنی بارش کے آسمانی نظام، نباتات، جمادات، حیوانات اور خود انسان کے اندر کے نظام اور خوبیوں اور رنگوں میں تفکر کرنے والے علماء ہی اللہ کی عظمت اور اس کی

شان کبریائی کو پہچان کر اس کی خشیت کا حق ادا کر سکے ہیں۔ آیات قولی میں تدبر کا رشتہ مقصد نبوت کی تکمیل، اور کار نبوت کی تکمیل ہے۔ آیات فعلی میں تفکر کرنا انسانیت اور اس دنیا کی بڑی خدمت اور اس کو اللہ کی معرفت اور خشیت سے جوڑنے کا بڑا کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو منتخب فرماتا ہے۔ ان خوش قسمت اور ملّت کے لیے سرمایہ افتخار سمجھے جانے والے افراد میں ایک بہت ممتاز نام ہے جناب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا۔ جن کو قرآن حکیم سے تعلق کے ساتھ سائنسی تحقیق اور تعلیم کے دوران معرفت کی یہ شاہ کلید مل گئی ہے۔ ان کے دردمند دل اور دانش مند دماغ کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کا کھویا ہوا وقار عطا فرمانے کے لیے شاید منتخب فرما لیا ہے۔ ان کے مضامین کا یہ مجموعہ ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ماہنامہ سائنس میں ایک دہائی سے زیادہ سالوں سے خوش قسمت افراد ان کے دل دردمند اور دماغ ہوشمند کی کاوشوں اور سائنسی مضامین سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور انھوں نے اپنے ساتھ ایک کارواں کھڑا کر لیا ہے، جس کے افراد نہ صرف ان کی فکر سے استفادہ کر رہے ہیں بلکہ ان کے اسلم انداز میں غور وخوض کرنے ہی نہیں بلکہ لکھنے لگے ہیں۔

بعض مرتبہ کسی عبقری اور قدآور شخصیت کا حقیقی تعارف بھی کچھ لوگوں کے لیے حجاب بن جاتا ہے ورنہ جو لوگ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب کی تحریک، ان کا کام اور ان کے درد سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ تعریف نہیں بلکہ محتاط تعارف ہے کہ وہ نہ صرف ایک سائنسداں ایک مدیر اور ایک محقق قلم کار ہیں بلکہ ایک تحریک اور اپنے اندر ایک اکیڈمی ہیں۔ وہ موجودہ دور میں ملت کی بڑی ضرورت اور ایک ایسے عارف باللہ اور محقق وعالم بآیات اللہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے نور ومعرفت کے دریچے کھول دیئے ہیں ان کے یہ مضامین کسی عارف رومی کی مثنوی سے کم نہیں۔ جس کو پڑھ کر گم کردہ رہ،

رہ یاب ہوتے ہیں۔

راقم السطور ان مضامین کو پڑھتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ اگر ہمارے مشائخ چشت کے زمانے میں یہ مضامین شائع ہوتے تو ان کو اپنے دل کے تاروں کو حرکت دینے کے لیے محفل سماع کی ضرورت نہ پڑتی اور قلوب کے انجذاب اور اس میں اضطراب پیدا کرنے کے لیے تحقیقی اور سائنسی مضامین کافی ہوتے۔

اس کے علاوہ معرفت خداوندی کے لیے مخلوقات میں تفکر کی نعمت کے احساس کے ساتھ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب کا درد قاری کے دل کو چھوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ جس صبحِ نو کی اُمید پر اپنے دل کو جلانے کی مہم چلا رہے ہیں یقیناً وہ ضرور آئے گی۔ بلکہ صبح کی پو پھوٹ چکی ہے۔ان کے درد واحساس کو سمجھنے کے لیے آپ بھی اس کتاب کو پڑھئے اور اپنے دل پر دستک دیجئے۔

’’علم کی یہ حقیقت واضح ہونے پر میں سنّاٹے میں رہ گیا۔ میرا تمام جسم واعضاء سن ہو چکے تھے، دل خوف سے کانپ رہا تھا، یا اللہ میں نے جو ماہ وسال جہالت کی نذر کر دیئے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ میں تو علم کے نام پر یا تو کچھ فن اور ہنر سیکھ کر نوکری کی تلاش کرتا رہا یا علم کے نام پر کچھ کتابوں کو رٹتا رہا اور ثواب کا منتظر رہا۔ میرا بندھ ضبط ٹوٹ گیا اور میں بارگاہِ ایزدی میں گر گیا۔ اے میرے پروردگار ہم کب تک علم کی اس خود ساختہ تشریح وتعبیر کا شکار رہیں گے، خود کو اور اپنی قوم کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھیں گے؟ یا اللہ کیا یہ ثمناً قلیلاً کے عوض بیوپار تو نہیں! کیا یہ تجاہل عارفانہ ہے؟ کسی مصلحت کا تقاضا ہے یا اپنی کم مائیگی اور نااہلیت کے اعتراف سے گریز۔ اے میرے پروردگار! مجھے کو اور میری قوم کو علم کی صحیح سمجھ دے۔ ہم علم کو دینوی علم کا نام دے کر، اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ چکے ہیں کہ اس کو سمجھ کر ہدایت پا لیتے۔ اے پروردگار! ہم کب تک خوش فہمی کا شکار رہ کر ذلت

کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ تو ہمارے درمیان ایسے راہبر، ایسے عالم پیدا کر دے جو ہمیں علم کی مکمل حقیقت سمجھائیں۔ ہمیں علم کی باطل تقسیم سے نکالیں تا کہ ہم تیری کائنات اور اس میں پھیلی تیری آیات کو سمجھ سکیں اور ان قوموں میں شامل ہو جائیں جن پر تو نے ان کے علم کی بدولت اپنی آیات کھول دی ہیں۔ یا اللہ ہمارے مقدر میں ایسی صبح، ایسا نیا سال ہے‘‘؟

وہ صرف حکیم سربہ جیب نہیں بلکہ اپنی تحریک، اپنے کارواں اور اپنی فکر پر لکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ کلیم سربکف بھی ہیں۔

صحبت پیرروم نے مجھ پہ کیا یہ نقطہ فاش
لاکھ کلیم سربہ جیب اک کلیم سربکف

(حضرت) **محمد کلیم صدیقی** (صاحب)
صدر جمعیت شاہ ولی اللہ
پھلت ضلع مظفرنگر (یوپی)

تقریظ

قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اس کا خطاب جن وانس سے ہے، ان کی ہی رہنمائی اس کا مقصود اساسی ہے، اس رہنمائی کا تعلق ان امور سے ہے جن میں انسان محض اپنے تجربات سے قول فیصل، اور امر حق تک نہیں پہنچ سکتا، عبادات میں انسانی اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے۔ معاشرت ومعاملات، تجارت ومعاش میں جو چیزیں تجربات انسانی کے دائرہ میں آتی ہیں، شریعت ان کی تفصیلات میں جاتی ہے، قرآن ان کے احکامات نہیں دیتا، اباحت کے ایک وسیع دائرہ میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن وہ دائرہ جس میں انسانی فیصلے افراط وتفریط کے شکار ہوتے ہیں اور بغیر الٰہی رہنمائی کے نکتہ حق ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن تفصیلی رہنمائی عطا کرتا ہے۔

قرآن کے ذریعہ جو مذہب پوری انسانیت کے لیے طے کیا گیا ہے جس کے اصول وضوابط اور بنیادی احکامات واضح کیے گئے ہیں وہ اسلام ہے، اسلام فطرت کا عین ترجمان ہے، کائنات پوری کی پوری غیر اختیاری طور پر ''مسلم'' ہے۔ انسان کو اسلام کی پسند وانتخاب وعمل کے لیے یک گونہ اختیار دیا گیا ہے۔ یہی اس کی آزمائش کا سرچشمہ ہے۔

انسان اور اس کائنات کے درمیان اسلام کا رابطہ ہے۔ ابروباد ومہ وخورشید فطری اسلام پر عمل پیرا ہیں، اور خدا تعالیٰ کے سامنے سربسجود، ان کی عبادت ان کی فطرت میں

ودیعت ہے۔ لیکن انسان سے شعوری طور پر اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

''سائنس''، علم کو کہتے ہیں۔ علم حقائق اشیاء کی معرفت وآگہی کا نام ہے، علم اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے، علم کے بغیر اسلام نہیں اور اسلام کے بغیر علم نہیں۔ یعنی معرفت پروردگار کے بغیر عبادت کے کیا معنی؟ اور وہ علم معرفت ہی کہاں جس کے ساتھ عبادت نہ ہو؟

کائنات خدا تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر گوناں گوں کا نام ہے، خدا کی معرفت اس کی صفات کے مظاہر سے ہی ہوتی ہے۔ انسان، حیوان، نبات، جماد، زمین، آسمان، ستارے، سیارے، خشکی، تری، فضا، ہوا، آگ، پانی اور بیشمار ''عالمین'' یعنی ''رب'' تک پہنچانے کے ذرائع اس کائنات میں ہر مسلمان کو بالخصوص اور ہر انسان کو بالعموم دعوت نظارہ دے رہے ہیں، اور اپنی زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ ان کی دریافت اور ان کی دنیا کا مطالعہ، مشاہدہ اور جائزہ انھیں ان کے خالق تک رسائی کی ضمانت دیتا ہے۔

سائنس کائنات کی اشیاء کی کھوج اور اس کے بہت سے حقائق کی دریافت کا نام ہے، علم اور سائنس دو کشتیوں کے مسافر نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی کشتی پر دونوں یکجان دو قالب، بلکہ ایک ہی حقیقت ہے جو دو ناموں سے سوار ہے، اب قرآن اور مسلمان اور سائنس کا کیا تعلق ایک دوسرے سے ہے، کسی پر مخفی رہ سکتا ہے؟

ظلم یہ ہوا ہے کہ جو عبادت سے کوسوں دور تھے، اور ابلیس کے فرماں بردار اور اطاعت شعار، ایک مدت سے انھوں نے علم (سائنس) پر کمندیں ڈال دیں اور کائنات کی تسخیر وہ اپنے مظالم اور شہوت رانی کے لیے کرنے لگے، ان کے سیلاب میں کتنے ہی تنکے بہہ گئے اور کتنے دوسرے پشتے بنا بنا کر آڑ میں آگئے، بہنے والوں کو تو اپنا بھی ہوش نہ رہا، لیکن آڑ لینے والوں کو مقصد اور وسیلے کا فرق بھی ملحوظ نہ رہا۔ غاصبوں سے حفاظت کے عمل نے اپنی مغضوبہ اشیاء سے بھی محروم کر دیا، اپنا مسروقہ مال بھی فراموش کر دیا گیا۔

ضرورت اس کی ہے کہ دوبارہ ''الحکمۃ ضالۃ المومن'' پرعمل کرتے ہوئے، اپنی چیز ناپاک ہاتھوں سے واپس لی جائے۔

قابل مبارکباد اور لائق ستائش ہیں جناب ڈاکٹر محمد اسلم پرویز صاحب کہ انھوں نے اس کی مہم چھیڑ رکھی ہے، کہ مغضوبہ و مسروقہ مال مسلمانوں کو واپس ملے اور حق بحقدار رسید کا مصداق ہو، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو مبارک و بامراد فرمائے، اور قارئین کو قدر واستفادے کی توفیق۔

وما علینا الا البلاغ

سلمان الحسینی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

25/مئی 2004ء

ایک اہم تحریک

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز سے میرا تعارف اخبارات ورسائل کے واسطے سے ہوا ہے۔ سائنس کی روشنی میں ان کے مذہبی مضامین کبھی کبھی روزنامہ راشٹریہ سہارا (اردو) میں پڑھنے کو ملے ہیں نیز ان کا رسالہ ''سائنس'' جو اپنے وقت کا موضوع اور زبان کے لحاظ سے منفرد رسالہ ہے ان کی علمی، فکری بصیرت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ حال ہی میں ان کی قابل قدر تصنیف ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' منظر عام پر آئی ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی واضح ہو رہا ہے کہ مصنف نے قرآن اور امت مسلمہ کا مطالعہ سائنس کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ عمومی طور پر مسلمانوں میں یہ تصور عام رہا ہے کہ اسلام اور سائنس باہم متضاد ہیں۔ دراصل یہ تصور غیر اقوام کی دین ہے کیونکہ موجودہ دور کے نت نئے انکشافات اور عقلیات پر مبنی تحقیقات نے ادیانِ باطلہ کے مختلف نظریات کی تردید کردی ہے۔ خصوصی طور پر وہ ادیان جو دیومالاؤں میں گم ہیں اور ان کے پاس کوئی مستقل لائحۂ عمل نہیں۔ ایسے ادیان کی تولیت کرنے والے ماڈرن سائنس سے پہلو تہی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات مجموعی طور پر یہ تاثر چھوڑنے کی سعی کرتے ہیں کہ مذہب اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کے بیچ ہم آہنگی ممکن نہیں۔

جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے اسلام دین فطرت ہے اور سائنس نظام فطرت کے مطالعہ کا نام ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نظام فطرت (جدید سائنس) کے مطالعہ

کے بغیر دین اسلام اور قرآن کی تفہیم کا حق مکمل طور پر ادا نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ نظام فطرت کے مطالعہ اور اس میں غور وفکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

''(ترجمہ) اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا ہے اور اس میں پہاڑ کے کھونٹے گاڑ دیئے ہیں اور نہروں کو بہا دیا ہے اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہیں ڈھانپتا ہے رات کو دن سے، ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔(رعد:3)''

مصنف کا دعویٰ ہے کہ مطالعہ کائنات کی ترغیب دینے والی آیات کی تعداد سیکڑوں میں ہے چنانچہ کہتے ہیں:

''قرآن کریم کی 756 آیات میں مطالعہ کائنات کی ترغیب دی گئی ہے اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ہمیں مناظر فطرت پر غور کرنے، عقل استعمال کرنے، آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ترغیب دیتا ہے''۔(ص:34)

اس سے قطع نظر کہ مطالعہ کائنات میں غور وفکر کی ترغیب دینے والی آیات کی تعداد کتنی ہے، قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تو ایک ایک آیت فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ ادھر اپنا حال یہ ہے کہ ہماری قوم قرآن حکیم کی عبارت کو بطور تبرّک پڑھ کر اسے طاق کی زینت بنا دیتی ہے اور سمجھتی ہے کہ قرآن کا حق ادا ہوگیا، فاضل مصنّف نے قرآن حکیم کو تدبّر سے پڑھنے اور اس کی بنیاد پر صحیفۂ کائنات میں غور وفکر کرنے کی جانب متوجہ کیا۔ ان کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔

عصری فلسفہ علم کا بنیادی عنصر ہے جس کے بغیر تعلیم نامکمل ہے۔ بات جب عصری فلسفہ کی روشنی میں کی جاتی ہے تو وہ مخاطب کو زیادہ متاثر اور بہتر طور پر مطمئن کرتی ہے۔ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور قرآن ایک ابدی کلام۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ وہ

ہر زمانے کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ہر دور میں پوری آب وتاب کے ساتھ چمکتا دمکتا رہا ہے۔ تقریباً سات سو سال قبل یونانی منطق کو عروج حاصل ہوا تو علم کا معیار منطق کو قرار دیا جانے لگا۔ علماء دین نے بھی منطق کو پڑھا اور سمجھا ایسے میں کسی کو بھی قرآن پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکا اور قرآن کریم منطقی دلائل کی روشنی میں بھی کھرا اترا۔ موجودہ دور سائنس کا دور ہے، آج کا انسان ماڈرن سائنس کی روشنی میں اپنی بات کا جواب چاہتا ہے۔ کلام الٰہی اپنے اندر بھرپور صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ مخاطب کو مطلوبہ دلائل کی روشنی میں مطمئن کر سکے۔ بس ضرورت ہے تدبر کی، غور وفکر کرنے کی اور کلام الٰہی کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی۔ مصنّف نے اس سمت قدم بڑھایا ہے نیز طریقہ کار بھی واضح کیا ہے یقیناً یہ ایک مستحسن امر ہے جس کے لیے مصنف قابل مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز بنیادی طور پر سائنس کے آدمی ہیں اور دہلی یونیورسٹی میں بوٹنی کے شعبہ میں تدریسی امور انجام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کئی اہم ذمہ داریاں ہیں، لیکن وہ اپنے مشغول اوقات سے قیمتی لمحات فارغ کر کے قرآن اور اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کر رہے ہیں۔ ان کی یہ کاوشیں دیکھ کر مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آتی ہے: ''وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (ترجمہ) اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے علاوہ دوسرے افراد کو لے آئے گا''۔

اس آیت کو گرچہ مفسرین کسی خاص واقعہ سے جوڑتے ہیں کوئی اس ضمن میں قوم تاتار کے قبول اسلام کا واقعہ نقل کرتا ہے تو کوئی اسے پیش گوئی مان کر تبدیلی قوم کا انتظار کر رہا ہے۔ میری ناقص رائے میں قرآن حکیم کی ایک ایک آیت اپنے اندر ابدی مفہوم رکھتی ہے لہٰذا اس آیت میں گر قوم سے مراد افراد لیا جائے تو یہ مفہوم واضح ہوجاتا ہے کہ اگر ذمہ داران حضرات دینی امور کی انجام دہی میں کوتاہی کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے

علاوہ دیگر افراد کو اس کام کے لیے کھڑا کردے گا۔ اس ضمن میں مجھے کہنے دیجئے کہ قرآن اور اسلام کی تعلیمات کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی ذمہ داری علماء کرام اور دینی تعلیم کے قلعے کہلانے والے دینی مدارس کی تھی مگر وہاں ایسا جمود طاری ہے جو ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا، تحقیقاتی کام قطعی طور پر بند ہے چند کتابیں کچھ بزرگوں کے اقوال اور قرآن وحدیث کا لفظی ترجمہ، دین کے ان قلعوں میں بس اس کے سوا کچھ نہیں، جہاں بزرگ پرستی عبادت کا درجہ رکھتی ہو، بزرگوں کے ذریعہ کی گئی چند روایتی تفاسیر کو حرف آخر سمجھ لیا گیا ہو، حتیٰ کہ نظام تعلیم کو اس لیے نہ بدلا جائے کیونکہ وہ بزرگوں کا مرتب کردہ ہے۔ جب دین کے قلعوں میں قرآن ہی نہیں احادیث کی کتب کی بھی تبرکاً اجتماعی عبارت خوانی ہونے لگے، وہاں تدبر، تفکر، مناظر فطرت میں غور، عقل استعمال کرنے، آنکھیں کھول کر دیکھنے، غور وفکر کرنے، جیسے الفاظ چہ معنی دارد، خاص طور پر ایسے دور میں جب اجتہاد کا دروازہ بند قرار دے کر تدبر وتفکر کی مشقت سے ہی پہلو تہی کی جانے لگے ایسے میں یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ کا مظاہرہ صاف نظر آرہا ہے کہ ماہرین علوم دین کے علاوہ ماہرین علوم عصری سے اللہ دین کا کام لے رہا ہے۔ آج ملک وبیرونِ ملک میں قرآن اور اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کرنے کی جس قدر بھی تحریکیں چل رہی ہیں ایک آدھ کو چھوڑ کر وہ سب ماہرین علوم عصری کی مرہون منت ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی شخصیت بھی ان میں سے ایک ہے جن کی نہ صرف زیر تبصرہ کتاب ''قرآن مسلمان اور سائنس'' بلکہ ان کا رسالہ ''سائنس'' ہر ماہ تشنگان علم وآگہی کے دلوں کو گرماتا ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں ایک خاص واقعہ کا ذکر نہ کروں۔ ماہنامہ ''سائنس'' کے مارچ 2004ء کے شمارے میں ''سورج اور اس کا خاندان'' مضمون پڑھنے کے بعد میرے علم میں جو اضافہ ہوا جس میں سورج کا قطر، زمین سے اس کی دوری، روشنی اور گرمی وغیرہ نیز ''کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ'' کی روشنی میں دوران گفتگو

ایک منکر جہنم دہریئے کو اس بندۂ ناچیز نے بفضلہٖ تعالیٰ جہنم کے وجود کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہوتے دیکھا ہے۔ مگر یہ باتیں عصری تقاضوں کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں۔ مصنّف کا شکوہ بجا ہے کہ:

''ایسا کوئی منبر نظر نہیں آتا، جہاں سے کوئی خطیب، کوئی حافظ، کوئی واعظ، کوئی ناصح، کوئی مبلّغ، کوئی داعی یہ پیغام دیتا سنائی دے، نہ ہی کوئی ایسا پلیٹ فارم نظر آتا ہے جس پر مبلّغ اور سائنسداں یعنی، عالم جمع ہوں اور قرآن کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں''۔ (ص 34)

مصنّف نے اس تحریک کی ابتداء کی ہے اور ''اسلامک فاؤنڈیشن برائے سائنس وماحولیات'' نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے یقیناً یہ تحریک ظلمتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ہلکی سی کرن ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تنہا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا، ضرورت ہے بڑے پیمانے پر ایسی تحریکیں شروع ہوں خاص طور پر علماء دین جاگیں اور ایسے افراد تیار کریں جو نیم عالم نہیں مکمل عالم ہوں۔

واللہ اعلم بالصواب

خاکسار

محمد اسلم قاسمی

ملّت اردو اکیڈمی

محلّہ سوت رُڑکی

مورخہ 24/4/2004

ضروری وضاحت

جب بھی ''قرآن اور سائنس'' یا ''سائنس اور اسلام'' کی بات کی جاتی ہے تو عموماً لوگوں کے ذہن میں دو چیزیں آتی ہیں ۔اوّل یہ کہ یہ سائنس اور اسلام یا سائنس اور قرآن کا مقابلہ اور تقابل ہے ۔دوم یہ کہ یہ شاید سائنس اور سائنسی معلومات کی مدد سے (نعوذ باللہ) کلام پاک کو صحیح ثابت کرنے یا اس سے اسلام کی حقانیت کا ثبوت فراہم کرنے کی کوشش ہے ۔ایسا سوچنا شاید غلط بھی نہیں ہے ۔کیونکہ ماضی میں ایسی کوششیں ہوئی ہیں اور اتنی ہوئی ہیں کہ ان کی چھاپ لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گئی ہے ۔تاہم ماہنامہ ''سائنس'' کی اس تحریک اور خود میری اپنی تحریروں کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے ۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تحریک اور میری کاوشیں ابھی اتنے حلقے تک نہیں پہنچی ہیں کہ ہر خاص و عام ان سے واقف ہوسکے ۔ حالانکہ میری کوشش یہی ہے کہ یہ پیغام گھر گھر اور ہر جگہ پہنچے ۔

میں سائنس، سائنسی طریقوں اور ان سے حاصل معلومات کو ایک اوزار، ایک ایسا آلہ مانتا ہوں جس کی مدد سے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے کلام پاک کو بہتر سمجھا جاسکتا ہے ۔ہمارے چاروں طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے اور شاہکار بکھرے پڑے ہیں، اگر ہم ان کو نہیں پہچانیں گے تو بھلا کیونکر خالق کی کاریگری اور عظمت کے قائل ہوں گے ۔تخلیقات کو سمجھ کر ہی خالق کی عظمت کا بھر پور احساس ہوتا ہے ۔حیاتیات

(بائیولوجی) کا ایک طالب علم جب زندگی کی بنیادی اکائی یعنی سیل کے بارے میں پڑھتا ہے ،اس ننھی سی جسامت کی بے حد منظّم کارکردگی دیکھتا ہے تو اسے اللہ کی قدرت کا احساس ہوتا ہے ۔اسی طرح جب فلکیات کا کوئی طالب علم، کائنات کی وسعت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، آسمان میں ستاروں اور سیّاروں کے درمیان پھیلے فاصلوں کو ناپنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا ذہن فطری طور پر اس خالق سے مرعوب ہوتا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ۔سائنس ہمیں اس کائنات اور اس میں پھیلے اجسام کو سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے ۔یہی تو وہ چیز ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ بار بار کلام پاک میں اشارہ کرتا ہے ۔یعنی مشاہدہ کرنے کا ،غور وفکر کرنے کا ،عقل استعمال کرنے کا ،علم حاصل کرنے کا ،دیکھنے کا اور سننے کا— اگر اس راستے سے اللہ کی عبادت ممکن نہ ہوتی تو وہ بھلا کیوں بار بار اس کی تاکید کرتا — اگر محض نماز، روزے یا زکوٰۃ کی ادائیگی سے عبادت مکمل ہوجاتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ارشادات میں محض ان کی ہی تاکید کرتا اور ذہن انسانی کو اسی طرف متوجہ کرتا— پس ثابت ہوا کہ اللہ کی عظمت اور خلّاقی سے مرعوب فرد کی نماز اور بندگی اس فرد سے مختلف ہوگی جو اُن حقائق سے نابلد ،نماز کو محض ارکان دین کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے ادا کرتا ہے ۔ بندگی محض اداؤں اور رسوم و ارکان سے نہیں بلکہ دل ودماغ سے ہوتی ہے ۔دل ودماغ کو بندگی کی طرف راغب کرنے کے لئے ان کو خالق کی عظمت کا احساس دلانا لازمی ہے ۔ہمیں سائنس کے اس رخ کو سمجھنے اور اپنانے کی ضرورت ہے ۔تاہم اس کے لئے لازم ہے کہ نئی نسل کے شگفتہ ذہنوں کو جب سائنسی تعلیم دی جائے تو ساتھ ہی انہیں قرآن فہمی کا درس بھی دیا جائے تاکہ وہ مکمل علم حاصل کرسکیں ۔یاد رکھیں مکمل بندگی کے لئے مکمل علم لازمی ہے ۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

انتشار و بے قراری کا ایک اور سال گزر گیا۔

کمزور قوم پر ذلّت و رسوائی کا ایک اور سال بیت گیا۔

جس قوم کو زمانے پر گواہ ہونا تھا، کہ اس نے حق بندگی اور حق رسالت ادا کر دیا اس پر ایک اور زمانہ گواہ ہو گیا کہ یہ ہنوز اپنے دین سے غافل رہی۔ جو خود ہی غافل ہو وہ بھلا دوسروں کو کیا بیدار کرے، کیا رہنمائی کرے اور کیا حق رسالت ادا کرے۔

''......اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملّت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام ''مسلم'' رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ......(الحج:78)

وائے افسوس کہ جس قوم کو اللہ نے اپنے کام کے لیے چنا تھا وہ اس کے دین کو اس کے قرآن کو مجبور کر کے اسے بے روح ارکان کی ایک گٹھری بنا کر ایک ناگوارِ خاطر بوجھ کی مانند کمر پر لاد کر چل نکلی ہے۔ وہ ''مسلم'' تو ہے مگر اللہ کی نہیں، بلکہ ہر اس باطل نظام کی جس میں اسے وقتی فائدہ نظر آئے۔

اس فساد کی صرف اور صرف وجہ وہ جہالت ہے جو ہم پر ایک تاریک رات کی طرح حاوی و طاری ہے۔ جہالت ـــ یعنی ناواقفیت ـ ناواقفیت دین سے، مسلم ہونے سے، اللہ کی آیات سے، اللہ کی ہدایات سے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جو طبقات بہ ظاہر ''تعلیم

یافتہ'' نظر آتے ہیں ان کی اکثریت بھی اسی جہالت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جو علماء (سائنسداں) ہیں وہ کائنات کے حقائق و قوانین کا مطالعہ اور تجزیہ تو کرتے ہیں مگر ان کو آیات اللہ نہیں مانتے اور نہ اس انداز سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جو حضرات قران و سنّت کی سمجھ کے دعویدار ہیں وہ اللہ کی آیات (تخلیقات) کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کا علم نہیں رکھتے:

''......وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں یقیناً رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں (آیات) ہیں، ان لوگوں کے لیے جو متقی ہیں''(یونس:5 - 6)۔

نتیجتاً یہ دونوں طبقات اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور کبھی کبھی علامہ اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہوئے بھی ناواقف اور لاعلم ہیں۔ یہ صورت حال اس وقت تک رہے گی جب تک ہم ''علم'' کی صحیح تعریف کو تسلیم کر کے اس کے حصول کے لیے کوشاں نہیں ہوتے اور اس سمت جہاد نہیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ علم کی دنیوی اور دینی تقسیم کرتے وقت بھی ہم ''دین'' سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

دین کے سہ حرفی مادّے (د۔ی۔ن) میں ایک طرف اطاعت و فرماں پذیری کا مفہوم ہے تو دوسری طرف آئین، قانون، نظم و نسق، جزا و سزا و بدلے کا بھی مفہوم ہے۔ اللہ کے دین کے علم میں اگر اللہ کے قوانین کا علم شامل نہیں ہے تو وہ کیونکر علم دین ہوگا۔ اللہ کی کائنات میں پھیلے ہوئے اس کے قوانین، جو اس کی آیات کو یعنی تخلیقات کو نظم و ضبط عطا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کی ہر تخلیق ''اس کی مسلم'' ہے، کیونکہ اس کے قوانین کے مطابق اس کے احکام کے تحت مستقل کام بھی کرتی ہے، ان کے مطالعے سے گریز کر کے کس طرح ''علم دین'' سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب ہم ایسا

نہیں کرتے تو ہم اللہ کی آیات کا جو قرآن میں احکامات کی شکل میں ہیں محض فقہی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں۔ علمی تناظر میں ان کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کی آیات کا علم لازم ہے۔ غور فرمائیے کہ آیات کا علمی احاطہ کرنے کا اللہ تعالیٰ کا کتنا واضح حکم ہے:

''اور جس دن ہم ہر اُمّت میں سے فوج کی فوج جمع کریں گے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، پھر ان کی جماعت بندی کی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ آجائیں گے (تو اللہ تعالیٰ) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم ان کو (اپنے) احاطۂ علم میں بھی نہیں لائے تھے (اگر یہ نہیں تو) تم کیا کرتے تھے؟'' (النمل:83 - 85)

پھر بھی ہم نہ تو قرآنی آیات کا اور نہ کائناتی آیات کا علمی احاطہ کرتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس نے بہترین، محرک اور فعال دین اسلام کو محض ارکان ورسوم کے ایک بے جان مجموعے کی شکل دیدی ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا فساد یہی جہالت ہے اور اس کو ختم کرنا آج کے دور کا اہم ترین عمل صالح ہے۔ علم سے دوری ہم کو قرآن سے دور لے گئی ہے۔ ہم قرآن کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے معذور ہیں۔ ہماری بندگی، رسمی عبادات اور پوجا پاٹ کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

آج اگر ایک فلسطینی بچہ ہاتھ میں پتھر لے کر اسرائیلی ٹینکوں کا مقابلہ کر رہا ہے، ایک مفلس ماں اپنے بیمار بچے کا علاج نہیں کرا سکتی کیونکہ اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ جدید علاج کا خرچ برداشت کر سکے، تو اس کی ذمہ داری بھی اس باطل تقسیم کو قائم ورائج کرنے والوں پر ہی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر علم کی تقسیم کا یہ زہر نہ پھیلایا جاتا تو مسلم قوم اور حکومتوں کا سرمایہ جو محض ''مذہب اسلام'' کی رسومات وارکان پر صدیوں سے بے تحاشہ خرچ ہو رہا ہے اس سے یونیورسٹیاں، تکنیکی و تحقیقی ادارے قائم ہوتے۔ آج اگر علوم وفنون کی باگ ڈور غیر مسلم نظام کے ہاتھ ہے تو اس کی ذمہ داری بھی ہم سب پر

ہے کہ کیوں ہم نے علم وفن سے کنارہ کشی کر کے اس میدان کو خالی چھوڑ دیا، باطل نظام کے پروردگان کے لیے کہ وہ اللہ کی آیات کو سمجھ کر اس کی قوتوں کو مسخر کر کے جو ثمرات حاصل کریں ان کی مدد سے انسانیت کا استحصال کریں، مفلسوں کا خون چوسیں اور مزید افلاس پیدا کریں۔ آج سے لگ بھگ ایک ہزار سال قبل جب علوم وفنون کی شمع مسلم سماج میں روشن تھی تو یاد کیجئے کیا منظر تھا۔ غیر مسلم مورخین سائنس لکھتے ہیں کہ قرطبہ وبغداد میں اسپتالوں میں آرام وآسائش کا وہ عالم تھا جیسا کہ محلات میں ہوتا ہے۔ بیماری سے صحت یاب ہوکر جب کوئی شخص اسپتال سے رخصت کیا جاتا تھا تو اس کو سرکاری خزانے سے کچھ رقم دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے لیے معاش کا انتظام کر سکے۔ آج اسپتال میں علاج کرانے کے لیے عام آدمی مقروض اور غریب آدمی معذور ہے۔

اس دور میں مسلم حکومتوں کی قوت کے آگے باطل حکومتیں تھراتی تھیں اور ان کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی جرأت نہیں کرتی تھیں۔

''اور (مسلمانوں) اپنے مقدور بھر قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنا ساز وسامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ کے (کلمۂ حق کے) اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے، نیز ان لوگوں کے سوا اوروں پر بھی، جن کی تمہیں خبر نہیں، اللہ انھیں جانتا ہے اور (یاد رکھو) اللہ کی راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا، ایسا نہ ہوگا کہ تمہاری حق تلفی ہو''۔ (الانفال:60)

یہی وہ جذبۂ بندگی تھا جس کے تحت مسلمانوں نے کبھی تاریخ کی پہلی خندق کھودی تو کبھی منجنیق ایجاد کی، تو کبھی پہلا راکٹ بنایا۔ بھلا دشمنانِ اسلام کو یہ بات کیونکر برداشت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا نہایت عمدگی کے ساتھ اس قوم کو ہدایت کے راستے سے بھٹکانے کا اس خوبی سے انتظام کیا کہ آج اس قوم کے خلفاء، بادشاہ بن گئے اور قومی

سرمایہ محلات اور سامان عیش وطرب مہیا کرنے میں صرف ہونے لگا۔ دین اسلام نے مذہب کی شکل اختیار کرلی، دنیوی نظام باطل قوانین کے تحت آ گیا اور مذہب چند رسوم وارکان کی ادائیگی کا نام۔

آیئے غور کریں کہ اپنے دور کی تکنیک کے اعتبار سے بہترین سامانِ حرب تیار رکھنے کے وقت سے لے کر آج جدید ترین ہتھیاروں کے سامنے ہاتھ میں پتھر لیے کھڑے بچے کے درمیان جو صدیاں گزری ہیں ان میں کیا تبدیلی آئی ہے ـــــ مسلمانوں، مسلم حکمرانوں اور ممالک کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، مساجد کی تعداد، نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، حج اور عمرے کے واسطے جانے والوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوا ہے، رمضان کے مہینے کی رونقیں اور ''برکتیں'' دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''کلمہ گو'' دنیا کے ہر حصے میں نظر آتے ہیں۔ گویا دین کے تمام تر ستون مضبوط ہوئے ہیں۔ پھر زوال کیوں؟ اس کی وجہ جاننے کے لیے ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس تمام عرصے میں وہ کون سا شعبہ ہے جو زوال پذیر ہوا ہے اور بلا شبہ یہ شعبۂ علم کا ہے۔ اولاً مال ودولت اور جاہ وحشمت کی محبت نے علم کی سرپرستی میں کمی کی اور پھر علم دنیوی اور دینی دھڑوں میں تقسیم کردیا گیا۔ اس وقت تک مسلمان کا ذہنی افق اتنا تنگ ،علم محدود اور مزاج تقلیدی ہو چکا تھا کہ وہ اس بابت کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ اور اپنی اولاد کو انہی خانوں میں بانٹنے لگا کہ یہ بچہ مدرسے جا کر حفظ کرے گا اور یہ اسکول جائے گا۔ اس تقسیم نے دین کی اس جامعیت کو ہی ختم کردیا جس کی سمجھ ''مسلم'' بننے کے لیے لازم ہے۔ آج ''دین'' اور ''مسلم'' پر اندھے اور ہاتھی کے واقعے کی مثال صادق آتی ہے کہ جس نابینا نے ہاتھی کے جس حصے کو پکڑا اسی کو ''عین ہاتھی'' یعنی ''عین دین'' سمجھ لیا۔ مزید ستم یہ کہ اس کے علاوہ بقیہ ''ہاتھی'' باطل ہے اور اس کو بیان کرنے والا مشرک، کافر، یا منافق۔

اب بھی وقت ہے کہ ہم مذہبی، مسلکی تعصّبات سے الگ ہوکر اوراپنی ''دین فہمی'' یا ''ذہانت'' (Intellectualism) کے زعم سے باہر آ کر حق کو پہچانیں اور تسلیم کریں۔ قرآن کریم کے احکامات کو سمجھیں اوران پر عمل کریں۔ ان احکامات میں تخصیص وتفریق نہ کریں کہ کچھ کو لازمی سمجھیں اور کچھ کو نظرانداز کریں۔ ڈریں اس وقت سے کہ جب ہاتھ میں پتھر لئے اس نوجوان کے ذہن میں یہ بات واضح ہوجائے کہ اس کی موجودہ حالت کا ذمہ دار کون ہے۔ اگر اس کے پتھر کا رخ اسرائیلی ٹینکوں کی جگہ ہمارے تھنک ٹینکس (Think Tanks) کی طرف ہوگیا تو ہماری یہاں بھی خیر نہیں اور آخرت میں تو یقیناً خسارہ ہی خسارہ ہے:

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ مگر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہوکر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں''۔ (البقرہ:85)

علم کیا ہے

لغات کے مطابق عِلم (عَلِمَ. یَعلَم) کا مفہوم ہے کسی چیز کو کماحقہٗ جاننا۔ پہچاننا۔ حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا۔ محکم طور پر معلوم کرنا (تاج العروس ومحیط المحیط)۔ اس طرح ادراکِ حقیقت کرنے والے کو **عَالِم** کہتے ہیں جس کی جمع **عَالِمونَ** آتی ہے۔ اور **عَلِیم** کی جمع **عُلَمَاء** یعنی گہرا اور پختہ علم رکھنے والے۔ اس مادّہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے ہیں، جس سے وہ شئے دیگر اشیاء سے مُتَمَیِّز ہو سکے۔ (مقاییس اللغتہ۔ ابن فارس)

قرآن کریم نے **سمع، بصر** اور **قلب** کو حصول علم کے ذرائع قرار دیا ہے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ہے)۔ دوسرے مقام پر **قَلب** کی جگہ **فؤاد** بھی کہا ہے (بنی اسرائیل:36)۔ اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجاتے ہیں۔ اور **فُؤاد** کی نسبت سے اس میں احساسات بھی آجاتے ہیں۔ لیکن چونکہ علم اسی وقت **عِلم** کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجہ تک پہنچ جائے اس لئے قرآن کریم نے وحی کو **عِلم** کہا ہے اور اس کی ضد کو **اھوَاء** (البقرہ:120)، یعنی انسان کے خود ساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیاں جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ہے۔ کیونکہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین اور حقائق و

شواہد پر ہوتی ہے۔ جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کے زور پر پیش کرتا ہے اور ان دعوؤں سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براہین طلب کرتا ہے۔ اسے اپنے دعوؤں کی محکمیت پر اتنا یقین ہے (اور یقین علم سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعوؤں سے انکار کرنے والوں کے متعلق اعلانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کرسکتے (المومنون:117) اسی لئے قرآن کریم کی دعوت، علی وجہ البصیرت دعوت ہے (یوسف :108) یعنی Rational ہے۔

اسی مادّے سے **عَالَم** بنا ہے (جس کی جمع **عَالَمِینَ** ہے) اسم آلہ کا ایک وزن **فَاعَل** بھی ہے جیسے **خَاتَم۔ مایُختَمُ بِہٖ۔ قَالَب۔ مایُقْلَبُ بِہٖ۔** وغیرہ۔ **عَالَم** بھی اسی طرح ہے جس کے معنی ہیں **مَایُعلَم بِہٖ**۔ یعنی وہ شئے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے۔ چونکہ خدا کا علم، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے ساری کائنات **عَالَم** کہلائی۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہر ایک بھی **عَالَم** کہلائے گا۔ مثلاً **عالم انسان. عالم ماء. عَالم نَار** وغیرہ۔ اس کی جمع مذکر سالم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہے۔ اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہوں تو انسانوں کو غالب رکھا جاتا ہے (راغب)۔ اسی لئے نسل یا قوم کو بھی **عَالَم** کہا گیا ہے۔ (اور قرن اور صدی کو بھی)۔ قرآن کریم نے **عَالَمِینَ** کو اکثر **اَقوَام** کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی کسی ایک زمانہ (age) کے ہم عصر انسان۔ **فَضَّلْتُکُم عَلَی العَالَمِینَ** (البقرہ:47) یعنی بنی اسرائیل کو (اس زمانے میں) ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی۔ نیز مختلف قسم کے لوگ یا دنیا بھر کے لوگ (الحجر:70)۔ اس جہت سے **رَبُّ العَالَمِینَ** (1/1) کے معنی ہوئے تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا۔ جس میں انسان بھی شامل ہوں گے۔

خدا کی ربّ ُ العَالَمِینِ کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آنی چاہئے۔ محض ذہنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رہنی چاہئے۔ اسی سے **حَــمــد** کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔اب آیئے غور کریں قرآن مجید میں علم کا بیان کس انداز سے ہے:

قرآن کریم میں ہے **عَلَّم اٰدَمَ الاَسْمَاءُ کُلَّھَا** (البقرہ:31) اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا۔ **یا عَلَّمَ الاِنسَانُ مَا لَم یَعلَم** (العلق:5) اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ اور **عَلَّمَ بِالقَلَمِ** (العلق:4) اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔ **عَلَّمَہُ الْبَیَانُ** (الرحمٰن:3) اسے بولنا سکھایا۔ ان آیات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح سکھایا، جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھ دی۔ اسے ان کی استعداد عطا کر دی۔ اس کی واضح مثال سورۃ مائدہ میں ملے گی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھاتے ہو **مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ** (المائدہ:4) اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری جانوروں کو سدھانے کا طریقہ نہیں سکھاتا۔ اس نے انسان میں اس کی استعداد رکھ دی ہے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ہے۔

لہٰذا ایک علم تو وہ ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ اور دوسرا علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں میں رکھ دی گئی ہے، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کر سکتا ہے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد۔ یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا۔ اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتی ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی، بشر کی ہوتی ہے۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ

کرنے کا حکم دیا گیا ہے (آل عمران:159)۔

اب آیئے سورہ البقرہ کی اس آیت پر غور کریں جس میں آدم کو یعنی نوع انسانی کو **اَلْاَسْمَاءَ کُلَّھَا** کا علم عطا کرنے کا ذکر ہے۔ اسماء، اسم کی جمع ہے جس کا مادّہ س م و ہے۔ اسم کے معنی ہیں کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ صاحب مفردات (راغب اصفہانی) اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''**مَعْرِفَۃُ الْاَسْمَاءِ لَاتَحْصُلُ اِلَّا بِمَعْرِفَۃِ الْمُسَمّٰی**'' یعنی جب تک مُسَمّیٰ کا علم نہ ہو اس کے اسماء کا تعارف کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کر کے اس کو پہچاننے کے لیے اس کا نام رکھتا ہے۔ غور فرمائیں کہ انسانی ذہن عین اسی انداز میں کام کرتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے خواص سے سمجھتا اور اس کے نام سے پہچانتا ہے۔ ایک ننھا بچہ جب اپنے اردگرد کے ماحول سے واقف ہونے کا عمل شروع کرتا ہے تو وہ اپنے اطراف کی اشیاء کو پہچانتا ہے ان کی شکل سے، ان کی خوشبو اور ذائقے سے یا ان کی آوازوں سے۔ وہ مانوس آوازوں پر مسکراتا ہے اور متوجہ ہوتا ہے۔ اپنی ماں کی خوشبو پہچانتا ہے۔ بعد ازاں ان اشیاء کے نام سیکھتا ہے اور ان پر ان ناموں کے لیبل لگا دیتا ہے کہ یہ ''ماں'' ہے۔ یہ ''ابّا'' یا ''پاپا'' ہے۔ بڑے ہو کر وہ سمجھتا ہے کہ شام کو چھت پر لگا یہ شیشے کا گولا جو روشنی دیتا ہے ''بلب'' کہلاتا ہے۔ تاہم ایک بالغ اور سمجھ دار آدمی کو بھی اگر آپ کسی ایسی چیز کا نام بتائیں جس سے وہ ''واقف'' نہیں ہے تو وہ نہ تو اسے سمجھ پائے گا، نہ ہی ذہن میں اس کا تصور پیدا کر سکے گا۔ البتہ جب وہ اس شئے سے ''واقفیت'' حاصل کر لے گا یعنی اس کا علم حاصل کر لے گا تو وہ بھی اس کی واقفیت میں شامل ہو جائے گی۔ یہی معاملہ ہے رب کے اسماء کے ساتھ۔ اگر ہم محض اللہ کے نام سے واقف ہوں لیکن اس کی قدرت کے کرشموں سے، کائنات میں پھیلے اس کے مظاہر اور آیات سے واقف نہ ہوں تو واقفیت کا حق ادا

نہیں ہوتا۔ بسم اللہ کی ادائیگی محض زبانی رہ جاتی ہے۔ کسی کام کو شروع کرتے وقت اللہ کا نام لینے کی حکمت یہی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ کے نام کے ساتھ اس کی صفات بھی یاد رہیں۔ اللہ کی صفات کی جھلک اس کی کائنات میں نظر آتی ہے، اس کی آیات میں نظر آتی ہے۔ جن کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے اور اس واقفیت کی کنجی علوم میں ہے۔ علم الآیات میں ہے۔

مذکورہ آیت میں **کُلَّھَا** کا لفظ نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ اس ایک لفظ نے نسل انسانی کو علم کے بحر ذخار سے آشنائی کی دعوت دی ہے۔ یعنی اللہ نے تو تمام اشیاء کا علم حاصل کرنے کی استعداد انسان میں رکھ دی اب یہ اس کی صوابدید، صلاحیت اور استطاعت پر ہے کہ وہ اس کا کتنا حصہ حاصل کر پاتا ہے۔ معرفت کے یہ مدارج وہ کیونکر طے کرتا ہے۔ اس کی نہایت غور طلب شکل یوں سامنے آتی ہے کہ سورہ البقرہ کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا اور **اَلنَّحلُ** میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے (**لَاتَعلَمُونَ شَیئاً**) اس نے تمہیں کان دیئے۔ آنکھیں دیں اور (سوچنے والے) دل دیئے اس لیے کہ تم شکر گزار بنو''۔ (النحل:78)
گویا انسان جب دنیا میں آیا تو اسے کسی شئے کا علم نہ تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کان، آنکھ اور سوچ سمجھ عطا کر دی تھی تا کہ ان اوزاروں کی مدد سے اللہ تعالیٰ کی کائنات کا علم حاصل کرے۔ اگر وہ اس طرح اللہ کی کائنات کا علم حاصل کرے گا تو اللہ کی ان نعمتوں کا، جو اس کو عطا کی گئی ہیں، عملاً شکر ادا ہوگا کیونکہ ان کا استعمال عین منشائے الٰہی کے مطابق ہوگا۔

سورۃ فاطر میں ہے: ''کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے۔ اور پہاڑوں (میں دیکھو کہ

کس طرح) سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں۔ اور اسی طرح انسانوں میں، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں۔ (27 - 28)''

یہاں نہایت وضاحت سے قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنھیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے **اِنَّمَا یَخشَی اللّٰہَ مِن عِبَادِہِ العُلَمَاء** ...... یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت و قدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو ''علماء'' ہیں۔ گویا اس کے بندوں میں سے علم رکھنے والے۔ اس علم و معرفت کی بدولت اللہ کی عظمت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لہٰذا اس سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہے علم کی وہ حقیقت اور تعریف جو لغات اور قرآن سے ثابت ہے۔

کائنات اور علم

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے یہ تمام کائنات مخصوص اصولوں اور قوانین کے تحت بنائی ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی اپنی کشش ہے جو مختلف چیزوں پر الگ الگ انداز سے اثر ڈالتی ہے۔ انسان جب اس حقیقت سے واقف ہوا تو اس نے مزید کھوج کی۔ اسے پتہ چلا کہ زمین پر ہر چیز قائم اسی کشش کی وجہ سے ہے۔ جس فضا میں وہ سانس لیتا ہے وہ بھی اسی کشش کی وجہ سے زمین کا غلاف بنی ہوئی ہے۔ پھر اس نے کشش اور زمین کی بناوٹ کے درمیان رشتہ دریافت کیا اور اس معلومات کی مدد سے اس نے دوسرے سیاروں کی کشش کو جاننے کی کوشش کی۔ انہیں قوانین کو چاند پر لاگو کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ چاند کی کشش کم ہے۔ چاند پر جانے کے بعد اس خیال کی تصدیق ہوگئی۔ اس طرح زمین کی بناوٹ کو سمجھنے کے بعد اس معلومات کی مدد سے انسان نے دوسرے سیاروں کی بناوٹ کو سمجھا۔ بعد ازاں خلائی جہازوں اور دیگر سائنسی آلات نے ان مشاہدات کی بھی تصدیق کر دی۔ گویا قدرت کے جو قوانین کائنات کے اس حقیر حصے یعنی زمین پر کارفرما ہیں وہ مختلف شکلوں سے پوری کائنات میں اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین تمام کائنات کا احاطہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو مرحلہ وار بنایا ہے۔ یعنی آج کی ہر چیز ارتقاء کی وجہ سے اپنی موجودہ شکل میں آئی اور اب بھی ارتقاء پذیر ہے۔ مثلاً آج نظر آنے والے

سخت سنگلاخ پہاڑ کل سمندر کا حصہ تھے۔ سمندر کی تہہ میں ریت کی پرت آہستہ آہستہ سخت ہوکر چٹان در چٹان بنتی ہے اور کروڑوں سال میں بلند پہاڑوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ زمین پر سر اُٹھائے پہاڑ، ہوا اور موسم کی سردی گرمی سے چٹخ کی ٹوٹتے ہوئے پھر سے ریت مٹی میں تبدیل ہو رہے ہیں جو پانی کے ساتھ بہتی ہوئی پھر سمندر کی تہہ میں جا کر کسی نئے پہاڑی سلسلے کو جنم دے رہی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے کائنات کو اصولوں اور قوانین کے تحت کیوں بنایا ہے؟ وہ تو مالکِ مطلق ہے وہ تو جس چیز سے کہتا ہے ''ہو جا'' وہ ہو جاتی ہے۔ گویا وہ آسمان میں تاروں کو چمکانا اور سیاروں کو تیرانا چاہتا تھا تو کسی بھی انداز سے یہ کام کر سکتا تھا۔ وہ حکم کرتا اور یہ سب کچھ ہو جاتا۔ انسان کو زمین پر آباد کرنا تھا تو یکلخت زمین وجود میں آجاتی اور انسان آباد ہو جاتا۔ پھل دار درخت پیدا کرنے تھے تو کیا ضرورت تھی کہ بیج نشوونما کے مراحل طے کرتا، موسم سے لڑتا اور برسوں میں پھل دار درخت بنتا۔ کسی بھی خاص وقت ایک دم درخت ظاہر ہو جاتے، پھل دیتے اور غائب ہو جاتے۔ یقیناً اگر وہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ سب اس انداز سے اور ان قوانین کے تحت کیا جنھیں انسان سمجھ سکے۔ اس نے آسمان میں ستاروں اور سیاروں کو قائم کیا تو ان کے درمیان کشش کے واضح اصول طے کر دیئے۔ اسے انسان کو زمین پر آباد کرنا تھا تو انسان کی آمد سے کروڑوں سال پہلے زمین آباد کر دی۔ زمین اور اس پر آباد مخلوقات میں ارتقا ہوتا رہا اور ہر دور کے بعد زمین رفتہ رفتہ اس شکل میں آتی گئی کہ انسان اس پر آباد ہو سکے۔ اس نے پیڑ پودے پیدا کیے تو ان کے نشوونما کا پورا طریقہ متعین کر دیا۔ یہ سب کیوں ہوا؟ جواب کلام پاک میں موجود ہے کہ یہ سب چیزیں نشانیاں ہیں اہل علم کے لئے، غور وفکر کرنے والوں کے لئے۔ گویا یہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی عین خواہش ہے کہ انسان اس کی تخلیقات کے بارے میں معلومات حاصل کرے، ان کی

بناوٹ پر غور کرے ،ان کی کارکردگی سمجھے، تا کہ وہ خالقِ عظیم کی عظمت کا سچے دل سے قائل ہو۔ یہ عظمت محض عقیدے، خوف یا لالچ کی وجہ سے نہ ہو بلکہ دل کی گہرائیوں سے ہو۔ خالقِ کائنات کی تخلیقات کا علم صرف اور صرف ان علوم کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے جن کو آج سائنس کہتے ہیں ۔ افسوس کہ جن علوم کی مدد سے ہم اپنے خالق کی سچی مدح خوانی کر سکتے ہیں، جن کی مدد سے ہم اللہ کی نشانیوں کو بہتر انداز سے سمجھ سکتے ہیں ،جن کی مدد سے ہم آج کے دور میں خیر اُمت کے طور پر اُبھر سکتے ہیں ،ہم انہی سے کنارہ کیے بیٹھے ہیں۔ تاہم مسلم نا اُمید نہیں ہوتا۔ ہمارا کام صدق دلی اور نیک نیتی سے کوشش کرنا ہے ۔آیئے آپ بھی ہمارا ساتھ دیجئے۔ اس سوچ کو گھر گھر پہنچائیں۔ آج کی جہالت، غلط فہمی اور شرک کے دور میں یہ ایک جہاد ہے جو آپ کی لبیک کا منتظر ہے۔

بھٹکا ہوا قافلہ

تاحدِ نظر پھیلے سمندر کے بیچ تیرنے والے ایک جہاز میں جو حیثیت قطب نما کی ہوتی ہے ،وہی حیثیت انسانی زندگی میں علم کی ہے ۔جس جہاز میں قطب نما ہی نہ ہو، وہ تو سمندر کی لہروں میں ڈولتے اور سنبھلتے اپنی عمر تمام کرلے گا۔ تاہم ذرا تصور کریں ایسے جہاز کا کہ جس کے پاس قطب نما تو ہے لیکن اس کے سازشی دشمنوں نے قطب نما کا رخ تبدیل کر دیا ہے۔ جہاز پوری توانائی اور عملے کی تندہی کے ساتھ، اپنے تصور میں منزل کی جانب گامزن ہے لیکن دشمن مسکرا رہا ہے کہ جب رُخ ہی صحیح نہیں تو بھلا منزل کیا ملے گی۔

علم کی صحیح راہ پانے کے لیے لازمی ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ علم کیا ہے؟ قرآن حکیم کے مطابق علم وہ شئے ہے جسے آنکھ نے دیکھا ہو، کان نے اس کے صحیح ہونے کی گواہی دی ہو اور فواد (قلب بہ معنی ذہن) نے اس کے دھوکہ نہ ہونے کی تصدیق کی ہو۔ سورۂ بنی اسرائیل کے چوتھے رکوع میں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ فرماتا ہے ''یہ وہ چیزیں ہیں، جو خدا نے تم پر بطور حکمت وحی کی ہیں''۔ اس حکمت کی ایک وضاحت یوں فرمائی ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝
(بنی اسرائیل:36)

اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں (کیونکہ) بیشک تیرے کان اور آنکھ اور ذہن (فواد) سب سے اس شئے کے متعلق پوچھا جائے گا۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس چیز کی تصدیق یہ تین اعضاء انسانی کردیں وہ علم ہے۔ساتھ ہی قرآن منع فرماتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور شئے کے پیچھے نہ پڑا جائے ۔اس حکمت کی رُو سے کسی ایسی شئے کو جس کی تصدیق ''صحیفۂ فطرت'' نے نہ کی ہو،علم کا بلند درجہ حاصل نہیں ہوسکتا ۔ مافوق الفطرت سبھی باتیں گویا ظن ہیں اور قرآنِ حکیم ان کے پیچھے پڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ گویا کہ وہ تمام دریافتیں جو صحیفۂ فطرت کے عالموں نے کی ہیں،علم کے زمرے میں آتی ہیں۔چاہے وہ علم ریاضی ہو یا علم طبیعیات ،علم کیمیاء ہو یا علم حیاتیات،علم طبقات الارض ہو یا علم خلاء۔

علم کی یہی تشریح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو جوق در جوق علم فطرت کی طرف لے گئی۔قرآنِ کریم نے صحیفۂ فطرت کے بے مثال طلسم کی طرف جب ان کی توجہ موڑی تو وہ ''پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوگئے'' نیز اللہ کے فرماں بردار بندوں میں شامل ہوگئے ۔ایسے بندے جو وہی کام انجام دے رہے تھے کہ جس کے واسطے انھیں پیدا کیا گیا تھا۔وہ رب کی ربانیت اور عظمت کے دل سے قائل ہوکر بندگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔وہ فطرت کے کارخانے میں دریافتیں کرتے گئے حمد وثنا کرتے گئے ۔انھوں نے چند سالوں میں دنیا میں صحیح اور یقینی علم کی بنیادیں ڈال دیں۔اس وقت یورپ (جو کہ اس وقت علم کا گہوارہ ہے)انسان کے ہی ظلم کے باعث سیکڑوں قسم کی ظنیّات میں مبتلا اور حقیقی علم سے دور تھا ۔سولہویں صدی میں یورپ کے بعض عالموں نے (قرآن حکیم کے نزول کے ایک ہزار سال بعد نیز اہل عرب کی علمی ترقیوں سے متاثر ہوکر) قریباً انہی الفاظ میں جو مذکورہ بالا آیت کے ہیں،اعلان کیا کہ وہی شئے سچ ہے جس کی تصدیق آنکھ،کان اور ذہن کردے ۔ باقی سب غلط ،وہم اور اندیشہ ہے۔اس اعلان کے بعد سے ہی یورپ کی نشاۃ ثانیہ یعنی اس عروج کی شروعات ہوئی جو آج اسے حاصل ہے۔اس کے برخلاف اسی دوران مسلمانوں کی بے راہ روی،قرآن کی غلط بینی اور تن آسانی نے اس شرف کو مسلمانوں سے چھین لیا۔آج پھر ضرورت ہے،اس بات کی کہ مسلمان قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے لیے راہ علم وعمل کا تعین کریں تا کہ بندگی کا بھرپور حق ادا ہو۔

جنت کی راہ

جنت ایک ایسی جگہ ہے جہاں پہنچنے اور رہنے کی خواہش ہر انسان کے دل میں ہے۔ وہ چاہے اسے جنت کہے، سورگ کہے یا پیراڈائز(Paradise)۔یعنی بلا تفریق مذہب وملت سبھی اس کے خواہش مند ہیں۔ جنت ہم ایک ایسی جگہ کو سمجھتے اور کہتے ہیں کہ جہاں ہمیں ہر طرح کا ظاہری اور باطنی سکون ہو۔ چار طرف سبزہ ہو، ٹھنڈک ہو، پانی کے چشمے رواں دواں ہوں، ہر طرح کی نعمت میسر ہو، اور ہمیشہ قائم رہے۔اس کے برخلاف جہنم ایک ایسی جگہ کو سمجھا جاتا ہے جہاں ہر شخص پریشان ہو، تکلیف میں ہو، اس کا چین وسکون غائب ہو، گویا ایک مسلسل عذاب میں ہو۔ قرآن کریم میں ان دونوں کیفیات کو یوں بیان کیا گیا ہے:

''وہ (اہل جنت) بے خار والے سدر اور تہہ بہ تہہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے''۔ (الواقعہ 28-34)

''وہ (اہل جہنم) لُو کی لپیٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ۔'' (الواقعہ 42-44)

اگر ہم ان دو متضاد کیفیات کا تصور کریں تو لگے گا کہ یہ تو ہم کو یہیں دنیا میں ہی

مختلف جگہوں پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔اگر ہم کسی گھنے جنگل میں جہاں ''انسانی ترقیات'' کا گزر نہ ہوا ہو، یا کسی پہاڑی علاقے میں چلے جائیں تو جنت کا سا سماں نظر آتا ہے اور اگر کسی شہری یا صنعتی علاقے میں داخل ہو جائیں تو بیشتر جگہ جہنم کا منظر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جانداروں کے وجود میں آنے سے قبل زمین کو ان کے لیے تیار کیا تھا(الرحمٰن: 10)، یہاں کا ماحول انسان کی آمد کے لیے سازگار کیا گیا تھا۔ ہوا میں حیات بخش آکسیجن کی مناسب مقدار قائم کردی گئی تھی اور اس کا توازن قائم رکھنے کے لیے ہرے پودوں کے ذریعے اس کی تجدید کا انتظام کردیا گیا تھا۔ صاف شفاف پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔اسی طرح دیگر ضروریات زندگی بھی موجود تھیں۔اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ایک قانون اور اس کی مشیت کے تحت جاری ہے۔انسان کو اس میں کامیابی کے ساتھ رہنے کے لیے اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔یہ ہدایات اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے انسانوں کو بھیجتا رہا۔ ہر دور میں اللہ کے رسول آئے اور اپنے وقت کی قوموں کو ہدایات دیں۔تاہم لوگ اللہ کے احکامات سے غافل ہوتے رہے اور نتیجتاً ہلاک ہوئے۔آج بھی دنیا اور اللہ کے اس نظام کا قائم رہنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جو آئین خداوندی کے مطابق عمل نہیں کرتا، اپنی زندگی نہیں گزارتا وہ خود اپنے اوپر ہی ظلم کرتا ہے۔یہی بات اقوام پر بھی ثابت آتی ہے۔ان کی بے راہ روی ان کے اجتماعی ظلم کی شکل اختیار کر کے ان ہی کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔اللہ کی اس کائنات اور اس کے قوانین کا کچھ نہیں بگڑتا جیسا قرآن کریم میں بتایا گیا ہے۔یہ ایک خاص وقت تک قائم ہے اور رہے گی۔''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے، مبنی بر حکمت اور ایک وقت مقرر تک کے لیے پیدا کیا ہے''۔(الاحقاف:3)

اگر ہم موجودہ دور پر نظر ڈالیں تو بیشتر ممالک کے زیادہ تر علاقے جہنم بنے ہوئے ہیں۔کہیں قحط یا خشک سالی ہے تو کہیں سیلاب اور طوفان، کہیں بیماریوں کا ہنگامہ ہے تو

کہیں جنگ وجدل، کہیں معاشی صورت حال ایسی ہے کہ انسان محتاج ہے تو کہیں وافر مقدار میں غذا ہے لیکن سیاسی وجوہات کے باعث اس کو مستحقین تک جانے سے روک دیا گیا ہے۔اگر اس تمام صورت حال کو ایک لفظ میں سمیٹنا ہو تو وہ لفظ ہوگا ''فساد''۔انسانی حرکتوں کے باعث پھیلنے والا فساد پوری نوع انسانی کو ہلاک کرنے کے درپے ہے۔

فساد درحقیقت صلاح کی ضد ہے۔صلاح کے معنی ہیں حالات کا درست ومتوازن رہنا لہٰذا توازن کا بگڑنا ہی فساد ہے۔فرد میں یا افراد کے ذریعے تشکیل شدہ سماج میں اگر کسی قسم کا عدم توازن ، بے ترتیبی ، بدانتظامی ، بدکرداری (کردار کا عدم توازن نیز مشیت الٰہی کے خلاف ہونا) یا ناانصافی پھیلتی ہے تو وہ فساد ہی ہے۔قرآن کریم نے مفسدین کے مقابلے میں مصلحین کا لفظ استعمال کیا ہے (البقرہ:11) ناپ تول کو پورا نہ رکھنا، کسی کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دینا، معاشی ناہمواریاں پیدا کردینا، لوگوں کے حقوق کو دبالینا، یہ سب فساد ہے (الاعراف: 85 الشعراء:183)۔صالح نظام کو درہم برہم کردینا ،صحیح ترتیب کو اُلٹ دینا بھی فساد ہے (النمل:34) ارتکاب جرم کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے (یوسف:73)۔دشمن حق کی بھی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو ملک میں فساد پھیلاتا ہے (البقرہ:205)۔

اب اگر ہم اپنے دورِ جدید پر نظر ڈالیں تو واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ دوصدیوں میں انسان اور انسانیت شدید انتشار کا شکار ہوئی ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ وہ دور بھی ہے جس میں انسان نے زبردست ''ترقی'' کی ہے۔سائنس وتکنالوجی کی مدد سے اللہ کی نعمتوں کے نئے نئے خزانوں کو دریافت کیا ہے اور ان کی مدد سے ہم کو ڈھیر ساری آسانیاں بھی فراہم کی ہیں۔بھلا یہ دو متضاد باتیں بیک وقت کیونکر ممکن ہوئیں۔اوّل الذکر یعنی انسان کے لیے پریشانیاں پیدا کرنا تو اللہ کو سخت ناپسند ہے تاہم اس کی نعمتوں کی کھوج کر کے، علم وہنر کی مدد سے ان کو انسانیت کی خدمت پر مامور کرنا رضائے الٰہی ہے۔اگر غور

کریں تو ان متضاد کیفیات کے وقوع پذیر ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ علم و ہنر کی کنجیاں
جن افراد اور اقوام کے پاس تھیں ان کے پاس اللہ کے احکامات کا تابع نفس نہیں تھا۔
یعنی وہ مومن نہیں تھے۔ انھوں نے وسائل کے جن خزانوں کو دریافت کیا ان کو اپنی
ملکیت سمجھا اور جس طرح چاہا ان کا استعمال کیا۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ
بنایا ہے جبکہ غیر مومن افراد و معاشرہ خود کو مالک و فاتح تصور کرتا ہے۔ یہ وہ بنیادی فرق
ہے جس نے آج زمین کو ''جہنم نما'' بنادیا ہے۔یعنی یہاں کا نظام نہ صرف جہنم جیسا
ہوتا جارہا ہے بلکہ انسانیت کی جہنم کی طرف راہنمائی بھی کررہا ہے۔لہٰذا اس نظام کے
تابع اور اس کو چلانے اور قائم کرنے والے بھی جانے اَن جانے میں جہنم کی طرف ہی
کوچ کررہے ہیں۔

جہنم کا راستہ

''اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ
بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں......'' (الانعام:165)

یہاں دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔اوّل یہ کہ انسان زمین میں خلیفہ ہے یعنی اللہ کے
قوانین کو نافذ کرنے والا۔دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ جس فرد(یا معاشرے) کو جو کچھ عطا
کرتا ہے اس میں اس کی آزمائش ہوتی ہے کہ آیا اس نے اللہ کے فضل کو، اس نعمت کو
اپنے تک ہی محدود رکھا یا پھر دیگر ضرورت مندوں تک بھی پہنچایا۔ اب یہاں سوال یہ
اٹھتا ہے کہ اپنے لیے کتنا رکھیں اور دوسروں کو کیا دیں۔ اس بات کی بھی واضح ہدایات
قرآن کریم میں موجود ہیں کہ اپنی ضرورت کا خرچ کرو اور بے جا اسراف سے بچو کہ یہ
شیطانی کام ہے۔اور اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

آج کا انداز زندگی دیکھیں تو اس کا ہر شعبہ بے جا اسراف پر ٹکا ہوا ہے ۔ پوری

معیشت کا دارومدار مسرفین پر ہے۔ جو سماج یا معاشرہ جتنا زیادہ مسرف ہوگا وہ اتنے ہی
زیادہ وسائل استعمال کرے گا اور اتنا ہی زیادہ فضلہ پیدا کرے گا۔اس بات کی واضح
مثال آج امریکی معاشرے اور معیشت سے ملتی ہے۔صنعتوں سے خارج ہونے والا
ایک اہم فضلہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس ہے جو کہ ایک کثیف اور جانوروں کے لیے
زہریلی گیس ہے۔فضا میں اس کی زیادتی کی وجہ سے موسم میں گرمی کا اضافہ ہورہا ہے
اور زمین کا اوسط درجہ حرارت بڑھتا جارہا ہے۔اس اضافے کی وجہ سے خطرہ ہے کہ
قطبین پر جمی برف پگھل جائے گی(ایسا دیکھنے میں بھی آرہا ہے) جس کی وجہ سے
سمندروں کی سطح میں اضافہ ہوگا اور سطح سمندر سے نزدیک واقع جزائر اور ممالک ڈوبنے
لگیں گے۔اسی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی کل عالمی پیداوار کا لگ بھگ ایک چوتھائی
حصہ محض امریکہ کے کارخانوں اور دیگر ''ترقیاتی'' کاموں کے نتیجے میں خارج ہوتا
ہے۔اب آپ تصور کریں کہ تمام دنیا کی آبادی کے مقابلے میں امریکہ کی آبادی کتنی ہے
اور محض اتنی سی آبادی پوری دنیا کا ایک چوتھائی فضلہ(کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کا) پیدا
کررہی ہے۔ کیونکہ مسرفین کی معیشت ہے اور مسرفین کا سماج ہے۔ دیگر مغربی ممالک
کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔ایسے افراد اور سماج اپنی خواہشات اور ضروریات کو مقدم
رکھتے ہیں۔ بہ ظاہر یا احسان جتانے کے لیے کچھ دکھاوٹی قسم کی امداد بھی کرتے
ہیں۔تاکہ غرباء اور غریب ممالک کے ہمدرد اور ان کے حقوق کے محافظ نظر آئیں۔لیکن
حقیقتاً ترجیح اپنے مفادات اور ''قومی افتخار'' کو دیتے ہیں۔

آج انسان کی ہوس، بے حسی اور مفاد پرستی نے تمام ماحول کو زہر آلود کردیا ہے۔
کارخانوں،موٹر گاڑیوں سے بے حساب نکلنے والے دھوئیں نے ہوا کو زہریلا کردیا ہے۔
فیکٹریوں سے خارج ہونے والے فضلے نے ندی نالے اور دریا زہریلے بنادیئے
ہیں۔پانی سے ہوتا ہوا یہ زہر مٹی میں سرایت کرچکا ہے۔حتیٰ کہ زیرزمین پانی کے قدرتی

چشموں میں بھی اب مرکری (پارہ) اور آرسینک (سنکھیا) جیسے زہریلے مادّے شامل ہو چکے ہیں۔ زمین پر صنعتیں یا رہائشی علاقے پھیلانے کے لیے جنگلات کا صفایا گزشتہ دوصدیوں سے جاری ہے۔ پیڑ پودوں کی کمی نے موسم کو خشک اور گرم کردیا ہے۔ بارشوں کا نظام بگڑ چکا ہے۔ ہمارے ملک کا بڑا حصہ پانی کی شدید قلت سے دوچار ہے۔ زیرِ زمین پانی کی سطح گرتی جارہی ہے۔ دریا خشک ہیں ہر جگہ فساد پھیلا ہوا ہے چاہے وہ زمین ہو فضاء ہو یا پانی —— اور اس فساد کا خمیازہ ہم مختلف قسم کی قلتوں اور بیماریوں کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔

''خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا۔ اس لیے کہ انھیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھادے۔ ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں''۔(الروم:41)

غور فرمایئے اللہ تعالیٰ ہمارے کرتوتوں کا مزہ ہمیں چکھا رہا ہے۔ کیا اب بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی۔

جنت کا راستہ

تمام دنیا کا درہم برہم ہوتا نظام اپنی خرابی کا خود گواہ ہے۔ ساتھ ہی یہ اس خیر اُمّت کو بھی پکار رہا ہے کہ جو اللہ کے کلام اور ہدایت کی وارث ہوتے ہوئے بھی نہ صرف اس سے غافل ہے بلکہ انسانیت کے واسطے عطا کی گئی اس امانت کو انسانوں تک پہنچانے میں بھی ناکام ہے۔

قرآن میں عدل وتوازن کا جو فطری طریقہ پیش کیا گیا ہے وہی اس وقت ذریعۂ نجات بن سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے جو ایک صالح سماج کی تشکیل کرسکیں۔ ایک ایسے سماج کی جس میں ہر شخص اپنے سے پہلے دوسرے کی

فکر کرتا ہے دوسرے کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو اللہ کے بندوں پر اُن کی ضرورت کے حساب سے خرچ کرتا ہے۔ اگرچہ شیطان اسے مفلسی سے ڈرا کر خرچ کرنے سے روکنا چاہتا ہے مگر وہ اللہ کے فضل پر بھروسہ رکھ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے (البقرہ:268)۔ نہ کسی چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے نہ تکبر کرتا ہے۔ اللہ کا خوف اس کو کسی بھی قسم کی خرابی پیدا کرنے سے روکتا ہے۔ وہ اپنا نقصان گوارہ کرتا ہے لیکن اپنا فضلہ اپنی گندگی باہر نہیں ڈالتا۔ انسانیت کی خدمت اس کا نصب العین ہوتا ہے۔ وہ بدی کو بہترین نیکی سے دفع کرتا ہے (الرعد:22)۔ لوگوں کو برے کاموں سے روکتا ہے اور بھلے کاموں کی نہ صرف ہدایت کرتا ہے بلکہ عملاً کرکے دکھاتا ہے۔ تاہم یہ وہ اعلیٰ اقدار ہیں کہ جن کی محض زبانی تعریف وتبلیغ سے کچھ کام نہیں چلا ہے۔ ان کو عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ جس وقت تک مسلمان اس نظام پر قائم رہے اور اس پر عمل کرتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف دنیا پر حکومت کی بلکہ عدل وانصاف اور امن وامان اور صلح وخیر کو عام کیا۔ جب وہ قرآنی نظام سے خود منحرف ہوکر طاغوتی طاقتوں کے آلہ کار بن گئے تو نہ صرف خود ذلیل ورسوا ہوئے بلکہ دنیا کا نظام بھی درہم برہم ہوگیا۔ کیونکہ قرآنی نظام کے امین خود ہی جب اس پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو پھر بھلا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا؟

علمی احاطہ

2000ء میں امریکہ کی ییل (Yale) یونیورسٹی میں مذہب اور سائنس سے متعلق ایک کانفرنس میں راقم کو شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ کانفرنس کا مقصد قدرت اور انسان میں موجود اچھائیوں کو اُجاگر کرنا تھا۔ درحقیقت یہ کانفرنس مذہب اور ماحولیات سے متعلق تھی۔ اگرچہ منتظمین نے تمام مذاہب کو مخاطب کیا تھا تاہم کانفرنس میں 99% شرکاء عیسائی تھے۔ لہٰذا کانفرنس کا رُخ عیسائیت اور ماحولیات کی جانب ہی رہا۔ مقالات پیش کرنے والوں نے پورے شدّ ومد سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عیسائی مذہب ماحول کی حفاظت کرنے، اس کو پاک صاف رکھنے اور انسان اور ماحول کے درمیان صحت مند رشتہ قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اسی انداز سے سوچنا اور کام کرنا چاہیئے تاکہ ہم انسانیت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرسکیں۔ مندوبین نے اپنے تجربات بیان کیے کہ کس طرح انھیں قدرت کے مظاہر ومناظر سے محبت پیدا ہوئی اور کیونکر انھوں نے اسے پروان چڑھایا۔ قدرتی مناظر کو ''دریافت'' کرنے کی بات مشرقی ممالک یا تیسری دنیا کے ممالک کے رہنے والے کسی بھی شخص کو چونکا دے گی۔ لیکن مغربی خصوصاً امریکہ کے شہریوں کے انداز زندگی کو اگر دیکھا جائے تو یہ عین حقیقت لگتی ہے۔ وہاں کی مصنوعی اور مشینی زندگی میں انسان اتنا بندھ چکا ہے کہ اسے قدرتی مناظر اور قدرتی چیزوں کو دیکھنے سمجھنے کا نہ تو وقت ہے اور نہ ہی شاید

رجحان۔ مذکورہ کانفرنس اسی رجحان کو پیدا کرنے کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اس کانفرنس کے دوران میرے دماغ کے کسی گوشے میں ایک بات مسلسل چبھتی رہی کہ عیسائی مذہب کے پیروکار کس طرح اپنے مذہب اور مقدس کتاب کی مدد سے لوگوں کو اصلاح کا پیغام دے رہے ہیں۔ اس کام میں ان کے بہترین سائنسداں اور مبلغ یعنی پادری ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ آخر ہم یہ کام کرنے میں کیوں ناکام ہیں۔ قرآن کریم کی 756 آیات میں مطالعۂ کائنات کی ترغیب دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ہمیں مناظر فطرت پر غور کرنے، عقل استعمال کرنے، آنکھیں کھول کر دیکھنے، غور وفکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاہم ایسا کوئی منبر نظر نہیں آتا جہاں سے کوئی خطیب، کوئی حافظ، کوئی واعظ، کوئی ناصح، کوئی مبلغ، کوئی داعی، یہ پیغام دیتا سنائی دے۔ نہ ہی ہمیں کوئی ایسا پلیٹ فارم نظر آتا ہے کہ جس پر مبلغ اور سائنسداں یعنی عالم جمع ہوں اور قرآن کریم کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں۔ انھیں انسانیت کی خدمت کی تلقین کریں۔ ہمیں خیر اُمت ہونے کا مفہوم سمجھائیں۔ اور اسی انداز پر ہمیں تیار کریں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ان کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔ ہمارا تمام زور خطابت واقعات، تاریخ، روایات، یا ارکان مذہبِ اسلام کے بیان تک ہی محدود رہتا ہے۔ قرآن کریم کا اصل پیغام عوام وخواص دونوں کی نظر سے گم ہوچکا ہے۔ سورہ النمل کی 84ویں آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''......تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا۔ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کررہے تھے''۔ گویا اللہ کی آیات یعنی نشانیوں اور مظاہر قدرت کا علمی احاطہ کرنا انسان کا اہم ترین فریضہ ہے کہ اس کے ادا نہ کرنے پر ہمیں آیات کو جھٹلانے کا ملزم قرار دیا جارہا ہے۔ کوئی صاحبِ عقل مجھے یا بتلائے کہ علومِ فطرت کو سیکھے بغیر کوئی اللہ کی ان نشانیوں کا، جو چاروں طرف بکھری پڑی ہیں، کیونکر احاطہ کرے گا؟ جب وہ ان کا علمی احاطہ کرے گا ان سے

واقف ہوگا ان کی افادیت کو سمجھے گا تو اپنی اس واقفیت اپنے اس ''علم'' کو وہ انسانیت
کی خدمت اور فلاح کے لیے استعمال کرے گا۔لوگوں کو فساد پھیلانے ،سماج کے لیے
نقصاندہ کام کرنے سے روکے گا۔ بھلا ایسے انسان سے بہتر ماحول کا دوست کون
ہوگا۔ مظاہر قدرت سے محبت اور ان کی حفاظت ہی ماحول دوستی ہے۔ امسال بھی
5 جون کو'' عالمی یوم ماحولیات'' منایا جائے گا۔کیا ہے کوئی خطیب اور واعظ ، ناصح اور
مبلغ جو اس موقع پر مسلمانوں تک قرآن کریم کا یہ پیغام بھی پہنچائے۔اور قرآن کریم
کے ان گوشوں کو روشنی میں لائے جن کو ہم نے تاریکی میں ڈال رکھا ہے۔

عدم توازن

اللہ رب العزت نے اس کائنات میں ہر چیز کو نپی تلی مقدار میں اور باہم توازن
کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔اس حقیقت کا بیان بے حد خوبصورت انداز میں قرآن مجید میں
یوں ہے:

(ترجمہ)''اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو، جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم
کیا۔''(الاعلیٰ 1-2)

''ہم نے زمین کو پھیلایا۔اس میں پہاڑ جمائے۔اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک
ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اُگائی۔''(الحجر:19)

''کوئی چیز ایسی نہیں، جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم
نازل کرتے ہیں، ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں''۔(الحجر:21)

یہ حقیقت اگرچہ چودہ سو برسوں سے قرآن مجید میں پوشیدہ ہے تاہم کائنات کی
بیشتر چیزوں کے درمیان توازن کا احساس ہمیں اس وقت پیدا ہوا جب مغرب کے
ہاتھوں تازہ (یا جدید) سائنس وجود میں آئی اور اس میں کچھ اہم عناصر کے مابین تعلق اور
توازن کا ذکر آیا۔آج جب بچے اسکول میں پیڑ پودوں اور جانوروں کے بارے میں
پڑھتے ہیں تو انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہرے پودے اور جانور، دونوں ہی اپنے ماحول
سے گیس جذب بھی کرتے ہیں اور خارج بھی کرتے ہیں۔ ہرے پودے دن میں ہوا

میں سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ جانور ہوا سے آکسیجن گیس جذب کرتے ہیں اوراس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ جانوروں کے لیے زہر ہے۔ جبکہ ہرے پودے اسی کی مدد سے اپنی غذا یعنی شکر تیار کرتے ہیں۔ آکسیجن جانداروں کے لیے ''گیس حیات'' ہے کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ سبحان اللہ کیا توازن ہے۔ ان گیسوں کی بنیاد پر بھی اگر دیکھیں تو اس زمین پر سبز پودوں اور جانوروں کے بیچ ایک توازن ہے۔ اگر جانور زیادہ ہو جائیں گے تو وہ ہوا میں سے زیادہ آکسیجن جذب کرلیں گے اور ساتھ ہی زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج کرکے ہوا کو بوجھل، آلودہ اور زہریلا بنادیں گے۔ ان جانوروں میں جو سبز خور ہوں گے ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا تو وہ مزید ہریالی کو کم کریں گے کیونکہ یہی ان کی خوراک ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ توازن بگڑے گا۔ اسی طرح اگر سبزہ زیادہ ہو جائے تو اسے زندہ رہنے کے لیے زیادہ مقدار میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس چاہئے ہوگی جو کہ کم جانور پیدا نہیں کرپائیں گے۔ ساتھ ہی ہوا میں آکسیجن کی مقدار بڑھ جائے گی۔ جو کہ ہرے پودوں کے فوٹو سینتھیسس (Photosynthesis) کے عمل کو سست کرنے کی صفت رکھتی ہے۔ گویا یوں بھی توازن ضروری ہے۔

اسی طرح ایندھن اور توانائی کے استعمال میں توازن کی ضرورت ہے۔ جب بھی کوئی چیز جلتی ہے چاہے وہ لکڑی ہو، کوئلہ ہو، پیٹرول ہو یا گیس، اسے جلنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے اور جلنے پر وہ ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر گیسیں خارج کرتی ہے۔ گویا جلنے کا یہ عمل گیسوں کے تبادلے کے معاملے میں جانوروں کے سانس لینے کے عمل جیسا ہی ہے کہ دونوں میں آکسیجن استعمال ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے۔ اس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ہوا میں سے ختم کرنے کے لیے ہرے پودے چاہئیں۔ اور جلنے کے لیے آکسیجن مہیا کرنے کے واسطے بھی ہرے پودے

چاہئیں۔ لہٰذا ایندھن کے استعمال اور سبزے کے درمیان جو توازن ہے اسے مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایسی مثالیں بیشمار ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور اس سے باہر کائنات میں پھیلے قدرت کے دیگر مظاہر میں بھی۔

آج ماحول میں کثافت اور آلودگی کا جو ذکر ہے اس کی بنیادی وجہ عدم توازن ہے۔ ہوا میں موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی جتنی مقدار پیڑ پودے جذب کرکے صاف کرسکتے تھے اس سے کہیں زیادہ مقدار ہم ہوا میں خارج کررہے ہیں۔ اپنے کارخانوں سے موٹر گاڑیوں سے۔ پانی جتنی غلاظت اور فضلے کو صاف کرسکتا تھا ہم اس سے زیادہ مقدار میں اور زیادہ خطرناک قسم کا فضلہ پانی میں خارج کررہے ہیں۔ نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ ماحولیاتی توازن بگڑ چکا ہے۔ جانداروں کی صحت تو خطرے میں ہے ہی، وجود بھی خطرے میں پڑ رہا ہے۔

سائنسی یا ماحولیاتی نقطہ نظر سے ہمارے ماحول کے دو اہم اجزاء ہیں۔ بے جان اور جاندار۔ بے جان اجزاء جیسے گیس، مٹی، پانی، معدنیات، ہوا، درجہ حرارت، وغیرہ اور جاندار اجزاء میں وہ سبھی چھوٹے بڑے جاندار آجاتے ہیں جو سمندر کی تہہ سے لے کر دور آسمان کی اونچائیوں تک، مٹی میں چھپے ننھے کیڑے مکوڑوں اور دیگر جانداروں سے لے کر ہوا میں موجود جراثیموں تک...... اس زمین کی فضا میں آباد ہیں۔ اب تک ہمارے سائنسدانوں نے ماحول کے بے جان اجزاء کے ساتھ ہی کھلواڑ کیا تھا۔ ترقی کے نام پر اور ترقی کی ضرورت کے واسطے ان اجزاء کا بے تحاشہ استحصال کیا تھا اور کررہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان اجزاء کے درمیان توازن بگڑ گیا۔ ہم آلودگی اور کثافت جیسے مسائل سے دوچار ہوگئے۔ اس عدم توازن کا احساس بھی ہمیں لگ بھگ دوسو سال بعد ہوا۔ صنعتی انقلاب کی آمد کے شادیانے بجانے کے بعد جب ہم ہوش میں آئے تو سانس گھٹ رہی تھی۔ اب ہماری توجہ کسی حدتک اس جانب ہوئی ہے کہ اس توازن کو مزید نہ

بگاڑیں نیز اسے سدھارنے کے لیے کم ازکم اتنے اقدامات تو کرلیں جن سے ہماری مادّی آسائشوں اور سیاسی فیصلوں پر آنچ نہ آئے۔ تاہم تشویشناک بات یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے مغربی ائمہ ٔسائنس اس توازن کو سنبھالنے کی کوشش کررہے ہیں تو دوسری طرف وہ بالکل ایک نئے انداز کا عدم توازن اور عدم استحکام پیدا کرنے کی شروعات کررہے ہیں۔ میرا اشارہ آج کی ان جدید تکنیکوں کی طرف ہے جن کی مدد سے نئی نئی اقسام کے جاندار پیدا کیے جاسکیں گے۔ ان تکنیکوں کو جینی ٹیکنالوجی ، جینی انجینئرنگ ،کلوننگ جیسے ناموں سے جانا جاتا ہے۔ یہ نام اب کچھ اجنبی نہیں رہے۔ ''ڈولی'' نام کی بھیڑ سے تو لگ بھگ پوری دنیا ہی واقف ہے۔ ان تکنیکوں کے بارے میں خود ماہنامہ ''سائنس'' میں اور دیگر مقامات پر بھی بہت کچھ لکھا اور کہا جاچکا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر مختصراً ان کے بارے میں لکھنا ضروری ہے تاکہ موضوع کے ساتھ انصاف کیا جاسکے۔

ہر جاندار چاہے وہ پیڑ پودا ہو یا جانور، چھوٹا ہو یا بڑا، زندگی کی بنیادی اکائی سے بنتا ہے۔ جس کو خلیہ یا سیل (Cell) کہتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل دنیا ہوتی ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ دنیا میں شاید زندگی وجود میں اسی ایک سیل کی شکل میں آئی ہوگی۔ اس سیل کے مرکز میں ایک گیند نما شئے ہوتی ہے جسے مرکزہ یا نیوکلیس (Nucleus) کہتے ہیں۔اس کے اندر باریک باریک دھاگے جیسے اجسام ہوتے ہیں جن کو کروموزوم (Chromosome) کہا جاتا ہے۔ انہی کے اندر وہ جینی مادّہ موجود ہوتا ہے جس کی مدد سے عادات واطوار ،صورت ورنگت ایک نسل سے دوسری نسل میں جاتی ہے۔اس کیمیائی مادّے کو ڈی۔این۔اے(DNA) کہتے ہیں۔ ہر جاندار کے جسم میں کروموزوموں کی تعداد ، بناوٹ اور کیمیائی ترکیب الگ الگ ہوتی ہے مثلاً انسان کے جسم کے ہر سیل میں46 کروموزوم جوڑوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ اگر چہ ہر

انسان میں 46 کروموزوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک انسان میں ان کروموزوموں کی کیمیائی ساخت یا یوں کہئے کہ جینی مادّے کی ترتیب وترکیب الگ الگ ہوتی ہے اسی لیے ہر ایک انسان دوسرے سے الگ اور یکتا ہوتا ہے۔

سیل اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صناعی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اب تک نہ جانے کتنے غیر مسلم اسی ایک سیل کی کارکردگی سے اللہ کی عظمت کے قائل ہوئے اور مسلمین میں شامل ہوگئے۔ اس سیل میں پائے جانے والے کروموزوموں یا ان کے اندر کے ڈی این اے مادّے میں تبدیلی کرکے جاندار کے وجود یا خواص میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ مجموعی طور پر ایسی تمام تکنیکوں کو ''جینی انجینئرنگ'' کا نام دیا گیا ہے یعنی جن کی مدد سے جینی مادّے میں انجینئرنگ کی جائے۔ اسی طرح اگر کسی ایک جاندر کے جینی مادّے سے بالکل اس کا ہم شکل یا ہمزاد تیار کیا جائے تو اسے ''کلوننگ'' کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں تکنیکیں اب باقاعدہ استعمال ہورہی ہیں اور ان کی مدد سے نئی اقسام کے جاندار تیار کیے جارہے ہیں۔

بدقسمتی سے اس کام اور اس تحقیق کی شروعات یہ سوچے بغیر کی گئی ہے کہ اس دنیا میں مختلف جانداروں کے درمیان بھی ایک ایسا ہی توازن پایا جاتا ہے جیسا کہ اس دنیا میں موجود بے جان اجزاء کے درمیان پایا جاتا ہے۔ آج ماحول کے بے جان اجزاء کے بارے میں تو ہم کسی حد تک کچھ جانتے بھی ہیں اور اسی معلومات کی مدد سے ہم اس کا توازن قائم کرنے کی ازسرنو کوشش کررہے ہیں لیکن اس زمین پر پائے جانے والے جانوروں کی انواع واقسام خاص طور سے خردبینی جانداروں کے بارے میں تو ہمارا علم آج بھی بے حد محدود ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کلام پاک میں اس حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے:

(ترجمہ) ''اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زینت بنیں۔ اور وہ بہت سی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک

نہیں ہے۔'' (النحل:8)

اورساتھ ہی ہمیں یاددلایاہے کہ اسے اپنی مخلوقات کامکمل علم ہے۔

(ترجمہ)''......اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''
(الانعام:101)

دوسری طرف آج خود محققین اس بات کوتسلیم کرتے ہیں کہ اس دنیامیں موجود خردبینی جانداروں کے بہت معمولی سے حصے سے ہم واقف ہوئے ہیں۔تازہ ترین جائزے کے مطابق ہماری یہ معلومات کتنی ہے یہ اس ٹیبل سے واضح ہوجاتا ہے:

جاندار کا خاندان	دریافت شدہ انواع	متوقع انواع کی تعداد (غیردریافت شدہ)	فی صد واقفیت
کاہی(Algae)	40,000	350,000	11.0
بیکٹیریا(Bacteria)	4,000	3,000,000	0.1
پھپھوند(Fungi)	70,000	1,000,000	5.0
پروٹوزوا(Protozoa)	40,000	100,000	40.0
وائرس(Virus)	5,000	500,000	1.0
کل میزان	1,59,000	5,450,000	3.0

خردبینی جاندار اس زمین پر ماحول کو سنبھالنے میں ایک بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نیز جینی تکنیک سے متعلق زیادہ تر تجربات انہی خردبینی جانداروں پر کیے جارہے ہیں اور انہی کی نئی نئی اقسام پیدا کی جارہی ہیں۔کل یہ نئی اقسام ماحول میں کس طرح کی تبدیلی پیدا کریں کسے معلوم ہے؟ یہ وہ خطرہ ہے جس کی طرف توجہ دینا بہت ضروری ہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ اندیشے محض خیالی اندیشے ہوں یا کسی خوف زدہ ذہن کی پیداوار ہوں۔ بہت سے جینی تجربات خطرناک ثابت ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تجربات اور ان کے نقصانات پر تحقیق کر کے مقالے شائع کرنے والے بھی انہی مغربی ممالک کے سائنسداں ہیں جو آج جینی تکنیک کے بے لگام گھوڑے پر سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ یہاں مثال میں ان جینی طور پر تبدیل شدہ مچھلیوں کی دوں گا جن پر تجربات دنیا کی تقریباً 40یا50 تجربہ گاہوں میں چل رہے ہیں۔ان میں سے لگ بھگ ایک درجن تجربہ گاہیں امریکہ میں، اتنی ہی چین میں اور بقیہ کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اسرائیل، برازیل، کیوبا، جاپان، سنگاپور، اور ملیشیا، وغیرہ میں ہیں۔کناڈا کی ایسی ہی ایک لیب میں رابرٹ ڈیولن نے سالمن(Salmon) قسم کی مچھلیوں پر تجربہ کیا۔ انھوں نے کوہوسالمن(Coho Salmon) کی گروتھ ہارمون جین میں تبدیلی کرکے اس کی بڑھوار کو تیز کردیا۔ نتیجہ میں جو مچھلیاں وجود میں آئیں وہ اپنی نسل سے اوسطاً 11 گنا زیادہ بڑی تھیں۔ تاہم ان میں سے کچھ 37 گنا زیادہ بڑی بھی تھیں۔ان میں بڑھوار بہت تیز تھی۔ ڈیولن کا خیال تھا کہ یہ جلدی بڑی ہوں گی اور وزنی ہوں گی اس لیے زیادہ آمدنی کا ذریعہ بنیں گی۔ یہ مچھلیاں، جنگلی مچھلیوں کے خاندان کی مدد سے بنائی گئی تھیں۔ چونکہ یہ مچھلیاں عام مچھلیوں کے ساتھ اختلاط کرسکتی تھیں اس لیے ان کو بڑے بڑے پنجروں میں بند کرکے سمندر میں رکھا جاتا تھا تاکہ یہ عام مچھلیوں سے اختلاط نہ کرسکیں۔ کیونکہ ایسا ہونے پر مچھلیوں کی تمام نسلوں کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ بدقسمتی سے ناروے میں ایسا ہی ہوگیا۔سیل (Seal) نامی سمندری جانوروں نے ان مچھلیوں کے پنجروں کو توڑ کر ان کو اپنی خوراک بنانا چاہا۔ کچھ مچھلیاں آزاد ہوکر پانی میں نکل گئیں اور وہاں انھوں نے مچھلیوں کی نسلوں کو برباد کردیا۔ یونیورسٹی آف منے سوٹا کے ایک محقق کے مطابق اسی حادثے نے ناروے کی مچھلیوں کی آبادی اور مچھلی صنعت کو زبردست

نقصان پہنچایا ہے۔ایسی مثالیں کئی ہیں۔ جانوروں میں بھی اور پودوں میں بھی۔

ایسے تجربات کی بنیاد اس سوچ پر ہے کہ (نعوذ باللہ) جانداروں میں جو کمی رہ گئی ہے اسے ہم تجربہ گاہ میں ٹھیک کرکے ایک ''بہتر'' جاندار وجود میں لے آئیں گے۔تاہم تجربات یہ سبق سکھا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر کسی مخلوق میں کوئی کمی رکھی ہے تو اس کی کچھ خاص وجہ ہے جسے خالق کائنات ہی سمجھتا ہے۔اس کی تخلیق بہترین اور مکمل ہے:

(ترجمہ) ''تم رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔'' (الملک:3-4)

کاش ان محققین کو کوئی یہ سمجھائے کہ یہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔آج سے دو صدی قبل ہم نے ماحول کے بے جان اجزاء میں جو تبدیلی اور عدم توازن کا سلسلہ شروع کیا تھا اسے آج ہم ماحولیاتی آلودگی اور کثافت کی شکل میں بھگت رہے ہیں۔ کون جانے کہ آج ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تبدیلی کرنے کی جو شروعات کر رہے ہیں وہ کل کس طرح کا عدم توازن پیدا کرے اور اس کی وجہ سے نہ جانے کیا نتائج مستقبل کی ان نسلوں کو بھگتنا پڑیں جو اس گناہ میں شامل بھی نہیں ہیں۔

(1998) میں 7 - 10 مئی کے درمیان امریکہ کی مشہور ہارورڈ یونیورسٹی میں ''اسلام اور ایکولوجی'' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں راقم الحروف نے شرکت کی تھی اور ایک مقالہ پڑھا تھا زیر نظر مضمون اسی مقالے کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔اس کرم وعنایت کے لیے احقر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہے۔ مذکورہ سیمینار میں شرکت کے واسطے راقم کو ہارورڈ یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا نیز سفر اور قیام کی ذمہ داری اٹھائی تھی جس کے لیے احقر یونیورسٹی کا شکر گزار ہے۔

نعمت جزدانوں میں

دیگر قدرتی وسائل کی طرح پانی کی صورت حال بھی تشویشناک ہے۔اس کے بے دریغ استعمال وفضول خرچی، اس کے تئیں لاتعلقی، اس کی تجدید کی طرف سے غفلت اور اس کو نجس یا آلودہ کرنے کے ہمارے انداز نے آج ناواقف لوگوں کو بیمار اور واقف کاروں کو اس حد تک محتاط کر دیا ہے کہ وہ محض صاف کیا ہوا پانی ہی استعمال کر رہے ہیں۔اس صورت حال کو سنبھالنے کے لیے دوطرفہ کاوشوں کی ضرورت ہے۔اوّل یہ کہ پانی کی آلودگی کو ہر حال میں چیک کیا جائے۔ یہ کام محض سرکاری سطح پر نہیں ہوسکتا۔عوام کو میدان عمل میں آنا ہوگا۔ اگر ہم نقلی دوائیں بنانے والوں یا کھانے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف مہم چھیڑ سکتے ہیں تو پھر پانی کو آلودہ کرنے والوں کا گھیراؤ کیوں نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی ذمہ داری سمجھنا ہوگی اور اسے نبھانا ہوگا ـــــ دوم یہ کہ پانی کے استعمال میں کفایت نیز نئے وسائل کی کھوج کرنا ہوگی۔ گزشتہ ایک ہزار سالوں سے ہم ہر عمل کے واسطے دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ ہر نئی پالیسی اور ایجاد کی توقع دوسروں سے کرتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ علم کا خزانہ یعنی قرآن پاک ہمارے پاس ہے لیکن ہم نہ تو اسے سمجھ کر پڑھتے ہیں، نہ ہی اس پر یعنی اللہ کی آیات پر غور وفکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے بتائے ہوئے راستے پر تلاش وجستجو کے لیے نکلتے ہیں۔ہم اسے اللہ کا راستہ سمجھتے ہی نہیں۔اللہ کے راستے میں نکلنے اور کام کرنے کا ہم نے

بہت ہی محدود مفہوم سمجھا ہے۔اللہ تعالیٰ کلام پاک میں بے جا اسراف سے منع فرماتا ہے۔کیا ہم کو پانی کے استعمال میں بھی محتاط نہیں ہونا چاہئے؟ پانی کے بہترین اور نایاب وسائل کی طرف اللہ تعالیٰ سورۂ رحمٰن میں ارشاد فرماتا ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ o بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّايَبْغِيٰنِ o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o

’’دوسمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے ۔ پس اے جن وانس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے‘‘۔ (الرحمٰن:19 -21)

افسوس ہم نے ان آیات پر غور نہیں کیا۔آج بحری سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سمندروں کے اندر بھی دریا بہتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ سمندروں میں بہنے والے دریا،زمینی دریاؤں سے زیادہ بڑے اور تیز رفتار ہیں۔اللہ کی قدرت کا یہ بہترین نمونہ ہے کہ دونوں پانی باہم ملتے نہیں ۔اسپین کے ایک مہم جو پونس ڈی لیون نے 1513ء میں سب سے پہلے ایک ایسے دریا کو دریافت کیا۔آج دنیا بھر میں سمندروں میں ایسے دریا پائے جاتے ہیں،جن کے بارے میں سائنسداں کھوج و دریافت میں لگے ہوئے ہیں۔سمندروں کی گہرائی میں واقع بہت سے دریاؤں کے متعلق تو ابھی کچھ بھی پتہ نہیں۔جن چند سطحی دریاؤں کے بارے میں اعداد حاصل ہوئے ہیں،وہ حیران کن ہیں۔ان میں سے ایک دریا 965 کلومیٹر چوڑا ہے تو دوسرے میں ایک سکینڈ میں پانچ کروڑ ٹن پانی بہتا ہے۔’’تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔‘‘

قابل عبرت ونصیحت یہ بات ہے کہ ہم ایسی نہ جانے کتنی نعمتوں کے اشاروں کو خوبصورت جزدان میں لپیٹ کر رکھے ہوئے ہیں یا پھر محض اسے دیکھنے اور یاد کرنے میں

مشغول ومصروف ہیں۔یقیناً یہ عمل اہم اور وقت کی ضرورت ہے۔تاہم اللہ کے کلام پر غور وفکر کرنا،اس کے بتائے ہوئے راستوں پر علم کی کھوج کرنا بھی تو اس خیرِ اُمت کی ذمہ داری ہے۔یہ کیا منطق ہے کہ ہم ہدایت کا ایک حصہ اپناتے ہیں اور دوسرے کی طرف غفلت، بے حسی یا تجاہل عارفانہ کا انداز اختیار کرتے ہیں:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَايَعْقِلُوْنَ O قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَمَاتُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّايُؤْمِنُوْنَ O

’’اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔ان سے کہو’’زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو‘‘اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہوسکتی ہیں۔‘‘(یونس:100 -101)

الحمراء سے آتی صدا

آٹھویں صدی سے پندرھویں صدی تک کا دور نہ صرف اسلام بلکہ علم وآگہی کے عروج کا بھی سنہری دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں مسلمانوں نے اسپین میں، جسے اس وقت اندلس کہا جاتا تھا، علم وآگہی کی وہ شمع روشن کی تھی جس نے موجودہ دور کی سائنسی ترقیات کی راہ روشن اور ہموار کی۔ اس دور کے مسلمانوں اور عیسائیوں کی تہذیب نیز ان کے علم وجہل کے تقابلی مطالعے سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنف مسلمان بھی ہیں اور عیسائی بھی، مشرقی بھی اور مغربی بھی۔ لگ بھگ سات صدیوں پر محیط یہ تاریخ کسی طلسم ہوش ربا سے کم دلچسپ نہیں۔ اس میں مسلمانوں کے علمی مزاج کے عروج وزوال کی وہ داستان چھپی ہوئی ہے کہ جس کو سمجھنا اور جس سے سبق لے کر اپنی اصلاح کرنا اب دن بہ دن ہی نہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے لیے اہم ہوتا جارہا ہے۔ کچھ یہی جستجو اور یہی تڑپ مجھے گزشتہ سفر کے دوران اسپین کی سرزمین پر لے گئی۔ اسپین پر قبضے کے بعد عیسائی حکمرانوں نے اسلامی تہذیب اور تاریخ کے ہرنشان کو مسخ اور برباد کرنے کی کوشش کی۔ ان کی شاندار وراثت کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی ہر ممکن سعی کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ تاہم اللہ کی قدرت کہ گزشتہ صدی کے اواخر سے وہاں کی حکومت اپنی مسلم وراثت کو عیاں کرنے پر مجبور ہوگئی۔ معاشی دباؤ کی وجہ سے ان کو سیاحت کو فروغ دینا پڑا اور سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لیے

وہ مجبور ہوگئے کہ اپنے ملک کی مسلم وراثت کو سیاحوں کی کشش کا مرکز بنائیں۔ چنانچہ اب سیاحت کو فروغ دینے والے تمام ترلٹریچر میں غرناطہ اور قرطبہ، طلیطلیہ ،سیول اور ملاغا کا ذکر تاریخی پس منظر میں ملتا ہے۔ مسلمانوں کی فوجوں کے راستے کو ''شاہراہ خلافت'' کے نام سے مشہور کیا گیا ہے۔ میں نے بھی غرناطہ سے قرطبہ کا سفر بذریعہ کار اسی شاہراہ پر کیا۔ جگہ جگہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنے مضبوط قلعے مسلمانوں کے فن تعمیر اور جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ اتنی بلندی پر کس طرح ایسے عظیم قلعے تعمیر کیے گئے۔ جن بلندیوں پر قلعے نہیں تھے وہاں حفاظتی مینار اور چوکیاں نظر آئیں۔ مسلمانوں کی فنی مہارت کی جھلک الحمراء کے قلعے ومحلات اور ان میں لگے باغات اور پانی کے نظام میں بھی نظر آتی ہے۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے مخصوص نالیاں بنا کر لائے ہوئے پانی سے نہ صرف باغات سیراب کیے جاتے تھے بلکہ فوارے بھی جاری رہتے تھے۔ اگرچہ علم وفن میں یکتا اس قوم کے زوال کے اسباب کا مطالعہ مزید ہوشربا ہے تاہم یہاں مختصراً دو قابل غور ونصیحت نکات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ اوّل یہ کہ ان کے زوال کا سبب بھی باہمی تفرقہ، انتشار اور خود غرضی اور خود پرستی کا جنون تھا۔ اقتدار کی رسہ کشی نے رفتہ رفتہ وہ ماحول ختم کردیا جو علم وہنر کے پنپنے کے لیے ضروری ہے۔ علم سے دوری انھیں اللہ کے احکامات سے دور لے گئی۔ دوم یہ کہ الحمراء کے محلات میں ایک کلمے کی بے انتہا تکرار نظر آتی ہے۔ ہر درومحراب کے نقش ونگار میں لکھا ہے ''ولا غالب الااللہ'' اللہ تعالیٰ کے غلبے اور حکومت پر ان لوگوں کے اعتقاد کی یہ انتہا تھی کہ اس قول کو آپ تقریباً ہر جگہ نہایت خوبصورتی سے نقش ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی عقیدت کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ ایسے مضبوط اعتقاد اور عقیدت رکھنے والی قوم کو اللہ نے کیوں ذلیل وخوار کردیا؟ تبھی میرا ذہن مجھے ماضی سے نکال کر اپنے دور میں لے آیا۔ مجھے خیال آیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے عقیدت

تو آج بھی بھر پور ہے کون سا مسلمان ہے جو اللہ اور رسول ﷺ سے عقیدت نہ رکھتا ہو۔ یہ خیال آتے ہی مجھے زوال پذیر اسپین اور آج کے مسلمانوں میں یکسانیت نظر آئی۔ دونوں ادوار میں عقیدت کا جوش لیکن عمل کا فقدان نظر آیا۔ ہسپانوی مسلمانوں نے جب تک اللہ کی عقیدت کے ساتھ اس کے احکامات پر بھی بندگی کے انداز میں عمل کیا وہ کامیاب رہے اور جب عمل ختم ہو گیا محض عقیدت رہ گئی تو وہ بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے، جس کی خاموش چیخیں آج بھی الحمراء کے ایوانوں میں گونج رہی ہیں۔ ضرورت ہے ان قلوب کی، ان کانوں کی جن پر اللہ نے مہر نہ لگا رکھی ہو۔ جوان اذانوں کو سنیں خود بھی بیدار ہوں دوسروں کو بھی بیدار کریں اور اللہ کی سچی بندگی کی طرف دوڑیں۔

علم: ایک نعمت

فَبِاَیِ آلَاءِ رَبِّکُ مَا تُکَذِّبٰنِ°

تو پھر (اے جن وانساں) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں/قدرتوں/عجائبات/کمالات/خوبیوں کو جھٹلاؤ گے۔

سائنسی اعتبار سے انسان اور دیگر جانوروں کے درمیان بہت کچھ یکساں ہے۔ دونوں پیدائش کے وقت کمزور ہوتے ہیں۔ غذا استعمال کر کے بڑے ہوتے ہیں، عمر رسیدہ ہو کر مر جاتے ہیں۔ دونوں کے بیشتر جسمانی نظام بھی بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ اسی لیے محققین اپنے تجربات جانوروں پر کر کے ان کے اثرات نوٹ کرتے ہیں۔ انسان اور دیگر جانوروں کے درمیان اہم ترین فرق عقل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہتر دماغ عطا کیا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کیوں عطا کی۔ خالق کائنات نے اپنی ہر تخلیق کو ایک فطری وصف کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ آگ حدّت اور روشنی دینے کے لیے بنی ہے تو یہ کبھی ٹھنڈک اور اندھیرے کی پیامبر نہیں ہوگی۔ مویشی اگر سبزی خور ہیں تو یہ کبھی گوشت خوری نہیں کریں گے۔ مکڑی اگر جالا بناتی ہے تو یہ کبھی سرنگ نہیں بنائے گی۔ قدرت کے کارخانے میں ایسی بیشمار مثالیں، نشانیاں (آیات) بکھری پڑی ہیں کہ جنھیں دیکھ کر یہ تصدیق کی جاسکتی ہے کہ ہر چیز اپنی فطرت کے عین مطابق اللہ کا حکم بجا لاتی ہے۔ اس کے برخلاف انسان کو اللہ تبارک تعالیٰ نے

آزاد فطرت پیدا کیا ہے کہ وہ حق وباطل، وحدت وشرک میں سے جس راستے پر چاہے چلا جائے۔اگرانسان کواس آزادی کے ساتھ شعور عطا نہ کیا جاتا تو بڑا ظلم ہوتا۔لہٰذا اس ذات کریمی نے انسان کو عقل وشعور عطا کیا کہ وہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ حق کیا ہے۔ حق کو پہچاننے کے واسطے ہی **ارحم الراحمین** نے دنیا میں پیغمبر بھیجے اور انہیں کتابیں دیں۔قرآن پاک میں جابجا اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا، اپنی رحمتوں کا ذکر کرتا ہے۔ساتھ ہی ہمیں غور وفکر کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو پہچاننے ،ان کا صحیح استعمال کرنے اور ان کا شکر ادا کرنے کے لیے لازمی ہے کہ انسان ان نعمتوں سے واقف ہو۔علم انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے نہ صرف آگاہ کرتا ہے بلکہ انسانی فلاح وبہبود کے واسطے ان کے استعمال کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ایک بےعلم شخص اگر چہ صبح شام اپنے جسم وقوت اور تمام وسائل کو استعمال کرتا رہتا ہے لیکن اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی کن کن نعمتوں سے فیض پا رہا ہے۔اس کے برخلاف اللہ کا ایک بندہ اور عالم (سائنس داں) خوب جانتا ہے کہ اس کے گھر کے باہر جو یہ بے مصرف نظر آنے والے پودے اُگ رہے ہیں جنھیں ہم ''جنگلی'' کہتے ہیں یہ کس طرح نہ صرف اللہ کی ایک اہم نعمت (زرخیز مٹی) کو باندھ کر رکھے ہوئے ہیں بلکہ کس طرح وہ ہوا کو بھی صاف کر رہے ہیں اور زمین کی تہوں میں چھپے کتنے اجزاء کو باہر لاکر اپنے جسم کا حصہ بنا رہے ہیں تا کہ وہ کسی مویشی کے پیٹ میں جاکر اسے تقویت دیں اور اس کے دودھ اور گوشت سے انسان یا اللہ کی دیگر مخلوق فیض یاب ہو۔ایسے کروڑ ہا کارکن اور سسٹم اللہ تعالیٰ کی متوازن کائنات کا ایک حصہ ہیں۔یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ بندگی اور علم لازم وملزوم ہیں۔اگر علم بغیر بندگی کے ہو تو خدشہ ہے کہ وہ انسانی فلاح وبہبود کے لیے استعمال نہیں ہوگا جیسا کہ آج کل سائنس وتکنالوجی کی بہت سی دریافتیں انسانی ہلاکت کا باعث بن رہی ہیں۔

تاہم اس کیفیت میں کم از کم نصف امید تو یہ رہتی ہے کہ اس علم کا کچھ نہ کچھ حصہ تو انسانی فلاح میں استعمال ہوگا ہی۔لیکن بغیر علم کے مکمل بندگی تو وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔علم ہی وہ شئے ہے کہ جو انسان کو حق کے بارے میں رٹاتی نہیں بالکل حق کی معرفت کراتی ہے،عقل وشعور کی مدد سے حق کو تسلیم کراتی ہے اور اس طرح ایمان کی جڑیں مضبوط کرکے اسے پروان چڑھا کر ایک تناور درخت بناتی ہے جو پھر شرک وکفر کی آندھی میں نہ تو بظاہر اور نہ بہ باطن ڈگمگاتا ہے۔کیا خوب نعمت ہے یہ علم جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو عقل وشعور کی مدد سے عطا کیا ہے''بیشک علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔''

غور وفکر

انگریزی دورحکومت میں جب ہمارے ملک میں مسیحی مشن اسکولوں کا سلسلہ شروع ہوا تبھی سے وہاں کا طریقۂ تعلیم یہاں رائج ہوگیا۔رفتہ رفتہ وہیں کے نصاب،معیار اور طریقے ہمارے یہاں لاگو ہوگئے۔ہماری یہ مغربی تقلید آج بھی جاری ہے۔جس انداز کے کورس وہاں چلتے ہیں وہی ہم چلاتے ہیں۔جس طرح وہاں تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح ہم یہاں تعلیم دیتے ہیں۔سائنس وٹکنالوجی کے انقلاب اور اس کے نتیجے میں اٹھنے والے علمی سیلاب نے وہاں کے ماہرین تعلیم کو اس بات پر مجبور کردیا کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائے۔لہٰذا بچوں کے نصاب بڑھتے گئے،کتابیں موٹی ہوتی گئیں، بستے بھاری ہونے لگے۔نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ بچے تو اس بوجھ (جو ننھے کندھوں پر بھی اتنا ہی تھا، جتنا ننھے ذہن پر) کو برداشت نہ کرسکے اور یا تو غیر معیاری اسکول میں پناہ گزیں ہوگئے یا پھر تعلیم سے کنارہ کش ہوگئے۔جو بچے ڈٹے رہے وہ معلومات رٹ رٹا کر ''معلومات دان'' تو بن گئے لیکن اس معلومات کو ''ہضم'' کرکے اپنی شخصیت کا جز نہ بنا سکے۔محض پڑھنے ، یادرکھنے اور اس کو دہرانے کے علاوہ ان کے ذہن نے کچھ بھی نہ سیکھا۔ذہنی صلاحتیں ،خاص طور سے غور وفکر کی صلاحتیں مفقود ہونے لگیں۔
چند سال قبل کچھ مغربی ماہرین نے اس بات کو نوٹ کیا اور ایک باقاعدہ تحریک شروع کی کہ بچوں کو ''غور وفکر'' سکھایا جائے تاکہ وہ معلومات کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھ

سکیں۔اب اس کام کے واسطے اسکولوں میں باقاعدہ مشقیں کرائی جارہی ہیں۔ہمارے ماہرین تعلیم تک بھی یہ رجحان جلد ہی پہنچ جائے گا اور مغرب کی تقلید کو فرض اوّل ماننے والے اب اس طریقے کو اپنے نظام میں شامل کرنے کی تیاری شروع کردیں گے۔

کسی بھی مطالعے اور مشاہدے سے غور وفکر کو الگ کردینا ایک سنگین علمی اور سماجی جرم ہے اور اس کے مہلک اثرات دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔آج کے دور کی سماجی اور معاشی انارکی میں بڑا ہاتھ اسی کم علمی ہے۔افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم، جوکہ اپنے آپ کو مسلّم اور خیر امت کہتے نہیں تھکتے ، نہ صرف اس ظلم کے چشم دید گواہ ہیں بلکہ خود اپنے نظام تعلیم میں اس کو اپنا چکے ہیں۔مغربی تعلیم کی آمد کے وقت ہم نے اپنی ''اسلامی شناخت اور ورثے'' کو بچانے کے لیے مدارس کا سلسلہ قائم کیا۔یقیناً یہ ایک مستحسن قدم تھا لیکن اس مدرسے کے نظام میں بھی غور وفکر کا وہی فقدان تھا جو کہ اس وقت کے مغربی نظام میں تھا۔یہ حال اس امت کا تھا کہ جس کی گائیڈ بک میں غور وفکر، تدبر و تعقل پر بے انتہا زور ہے۔قرآن کریم میں محض فکر کو 490 مقامات پر مختلف انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔مگر وائے افسوس کہ ہم قرآن مجید میں ''افلا تتفکرون'' اور ''افلا تعقلون'' کو نہایت عقیدت اور خوش الحانی سے پڑھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔کبھی ان آفاقی پیغامات پر غور نہیں کرتے کہ آخر قرآن کریم بار بار غور وفکر کرنے ،عقل کا استعمال کرنے اور اللہ کی آیات کا مطالعہ کرنے پر کیوں زور دے رہا ہے۔اگر ہم قرآنی تعلیمات پر عمل کرتے تو آج ''غور وفکر'' ہمارے درس وتعلیم کا اہم حصہ ہوتا۔اور اگر غور وفکر سے کام لیتے تو اللہ کی نشانیاں پہچانتے ،ان کی کارگردگی سمجھنے کے لیے ان علوم کا لازماً سہارا لیتے جن کو ہم نے کبھی مغربی تو کبھی ملحدی اور کبھی جدید یا دنیوی علوم کہہ کر اپنے اوپر حرام کرلیا ہے۔اگر ہم قرآنی تعلیمات کو مکمل انداز سے اپنا لیتے تو ہمارا نظام تعلیم آج ایک ایسا ماڈل ہوتا ہے کہ جس پر عمل کرنے کے لیے دنیا مجبور ہوجاتی۔اور یہی تو ہمارا کام تھا۔اس خیر امت کا

کہ وہ دنیا کی امامت کرے۔لیکن بھلا جب امام ہی گمراہوں کے ساتھ ان کا ہم خیال
اورمقلد ہوتو پھرکیسی امامت اورکیسی خیرامت ۔"تو کیاتم کتاب کے ایک حصے پر ایمان
لاتے ہواور دوسرے حصے کے ساتھ کفرکرتے ہو۔پھرتم میں سے جوایسا کریں ان کی سزا
اورکیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہوکر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب
کی طرف پھیر دیئے جائیں۔"(البقرہ:85)

حق کی تلاش

کلام پاک میں کن چیزوں کو حق یعنی سچائی کہا گیا ہے اوران میں سے کس پر کتنی
تاکید کی گئی ہے،اس بات کا جائزہ لیں تو ایک نہایت قابل توجہ حقیقت سامنے آتی ہے۔
حق کا استعمال اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے بارے میں تین جگہ اورقرآن حکیم کے بارے میں دس
جگہ ہے۔ایک جگہ انبیاء کو حق کہا گیا ہے۔ایک جگہ قیامت کے وزن کو حق کہا
ہے"وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ "نیز ایک مقام پر موت کے نشے"سَكْرَتُ الْمُوتَ "کو
برحق کہا گیا ہے۔اس کے علاوہ بقیہ تمام مواقع پراللہ تعالیٰ نے اپنی فطرت اور خلاقی کو حق
بیان کیا ہے۔قرآن کریم میں تیس (30) سے بھی زیادہ مقامات پر پرودگارِ عالم نے اس
کائنات اوراس میں پھیلی ہوئی اپنی تخلیقات کو حق یعنی سچائی بتایا ہے۔مثلاً

(1)خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ O (العنکبوت:44)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو سچائی کیساتھ پیدا کیا ہے۔بیشک اس میں ایمان والوں کے لیے بڑا اشارہ ہے۔

(2)مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَاَجَلٍ مُّسَمًّی(الاحقاف:3)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ اس کے درمیان ہے،نہیں پیدا کیا مگر سچائی کے ساتھ اور ایک وقت مقررہ تک۔

(3) هُوَالَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْراً وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَالسِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ط مَاخَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ ط یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (یونس:5)

اور وہ خدا ہے جس نے سورج کو شعلہ بنا دیا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم سنوں کی گنتی کر سکو اور حساب کر لو۔ خدا نے یہ پیدا نہیں کیا مگر ساتھ حقیقت کے۔ ان اشاروں کو علم والی قوم کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔

ان آیات پر اور ان کا مخاطب کون ہے اس بات پر غور کرنے سے پہلے اس بات پر توجہ دینا ضروری ہے کہ پروردگار نے اپنی تخلیقات کو برحق بتاتے ہوئے ان کی طرف انسان کی توجہ کیوں مبذول کرائی ہے۔ اہل ایمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ، قرآن حکیم، انبیاء کرام، قیامت اور موت پر یقین رکھیں۔ چونکہ یہ ایمان کا جزو ہیں، لہٰذا ان پر یقین تو اہل قرآن کو ہوگا ہی لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کی توجہ اس جانب کھینچ رہا ہے کہ جہاں اگر وہ غور وفکر اور عمل کریں گے تو ان کا ایمان مزید مضبوط اور یقین کامل ہوگا۔ خالق کے تئیں ان کی عقیدت ومحبت بڑھے گی، ساتھ ہی اس کی عظمت اور ہیبت اس طرح دل نشین ہوگی کہ وہ اس کی حکم عدولی کی جرأت بھی نہ کریں گے۔ جس دل میں اس انداز سے ایمان جاگزیں ہو جائے گا اس پر یقیناً شیطان کا زور نہ چل سکے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو انجام بد سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے جن آیات میں اپنی تخلیقات کا ذکر کیا ہے وہاں خطاب اس قوم سے ہے جو فکر رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ''۔ علم رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْن''۔ عقل رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ''۔ یقین رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ''۔ نعمتوں کا رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کرتی ہے یعنی حقیقی شکر کرتی ہے ''لِقَوْمٍ یَّشْکُرُوْنَ''۔ (حق کو) سننے کی صلاحیت رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ یَّسْمَعُوْن''۔ (عملاً اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی مکمل عظمت پر) ایمان رکھتی ہے ''لِقَوْمٍ

یُؤْمِنُوْنَ''۔ قدرت کے کارخانے میں سرگرم عمل ہے۔ ''لِقَوْمٍ یَّعْمَلُوْنَ''۔ مستقل مزاج، محنتی اور قدردان ہے ''لِکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ''۔ نیز اللہ کے عذاب سے خوفزدہ ہے محتاط ہے ''لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَیْنَ هُمَا لٰعِبِیْنَ ο وَمَا خَلَقْنَا هُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ ط لٰئِنَّ اَکْثَرَهُمْ لَایَعْلَمُوْنَ ο (الدّخان: 38- 39)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جوان کے درمیان ہے کھیلتے کھیلتے نہیں بنایا۔ ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا مگر بطور حقیقت کے۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔

گویا اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے کھیل کھلواڑ میں نہیں بنایا بلکہ نہایت سچے اصولوں اور ضوابط کی بنیاد پر یہ پورا نظام قائم کیا ہے، یہ کس خوبصورتی اور حسن ترتیب سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تو اس کا علم حاصل کرنا ہی لازمی ہے۔ تاہم خالق کائنات نے کیا خوب کہا ہے کہ اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے۔ یہ انسان کی بے حسی اور ناشکری کے تئیں اللہ تعالیٰ کا شکوہ بھی ہے اور ایک حقیقت بھی۔

کفر کے معنی انکار کے ہیں۔ انکار دو طرح سے کیا جاسکتا ہے یا تو زبان سے باقاعدہ اعلان کر کے یا عملاً منکر ہو کے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے یہ کائنات جس طرح پیدا فرمائی ہے وہ اس کی تخلیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اپنی تخلیق پر اسے بجا فخر ہے جس کا اظہار اس نے یوں کیا ہے:

وَالسَّمَاءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ο وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ο (الذّٰرِیٰت: 47 - 48)

اور اس آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور ہم ضرور بڑی وسیع طاقت رکھنے والے ہیں اور اس زمین کو ہم نے خود فرش کیا، تو دیکھو ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔

اس انداز کے ارشادات ہم کو قرآن پاک میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ایک طرف رب العالمین اپنی تخلیقات کا ذکر کر کے ہم کو انھیں دیکھنے، سمجھنے، ان پر غور وفکر کرنے اور ان کا ادراک حاصل کرنے کے واسطے پیہم عمل کرنے کا حکم دے رہا ہے تو دوسری طرف ہم اگرچہ زبان سے تو انکار نہیں کرتے کہ یہ سب اس نے عبث بنایا ہے۔ تاہم ان عظیم الشان اور محیر العقل تخلیقات کی طرف سے بے التفاتی برت کر کے ان پر توجہ نہ دے کر، ان کی کارکردگی اور تخلیق کو سمجھنے کی کوشش نہ کر کے عملاً اس سے انکار کرتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جو لوگ اس کائنات کو، فطرت کو باطل سمجھتے ہیں، قرآن کریم ان کو کافر قرار دیتا ہے اور ان کے جہنمی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ط O
(ص: 27)

ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، جھوٹ نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہیں، تو حیف ہے کہ ان کافروں کو جہنم ہوگا۔

افسوس کا مقام ہے کہ ہم زبان سے تو کفر نہیں کرتے تاہم عملاً اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی تعمیل نہ کر کے ''صحیفۂ فطرت'' کی طرف سے غافل ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر قسم کے کفر، شیطان کے بہکاوے اور جہنم سے محفوظ رکھے (آمین)

خلیفہ اور علم

''پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ 'میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں' انھوں نے عرض کیا 'کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزی کرے گا؟ آپ کی حمد وثناء کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے عرض کیا نقص سے پاک ہے تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتادیئے تو اللہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔'' (البقرہ: 30 - 33)۔

منقولہ بالا آیات میں اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کی حیثیت، اس کا مقام، عمل کی نوعیت، اہمیت وفوقیت نیز عبادت وبندگی کے متعلق وضاحت فرمائی ہے۔ پہلی

قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے جس کی رُو سے انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کے نظام کو، جو کہ اللہ تعالیٰ نے حق پر نیز عدل وتوازن کے ساتھ قائم فرمایا ہے، عین اس کی منشاء کے مطابق نہ صرف چلنے دے بلکہ اس کا اہتمام بھی کرے کہ یہ عدل وتوازن قائم رہے۔ خلیفہ ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے انسان کو کچھ اختیارات بھی عطا کیے ہیں ، اس کائنات کی کچھ قوتیں بھی اس کے لیے مسخر کردی ہیں۔ اسی آیت میں آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کے آگے جھک جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے ہی اس کائنات کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کا آدم کے آگے جھکنا وضاحت کرتا ہے کہ ان کو اور ان کے ذریعے چلائے جارہے نظام کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کردیا۔ جہاں تک اللہ کی منشا اور مشیت ہو وہاں تک انسان اس زمین کے نظام کو کنٹرول کرنے کا مجاز قرار دیا گیا۔ آدم کی طرف کچھ اختیارات منتقل کرنے پر ہی فرشتوں کو یہ تشویش ہوئی کہ کہیں اختیارات کی یہ منتقلی بدانتظامی نہ پیدا کردے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس اندیشے کا جس طور جواب دیا وہ دوسرا قابل غور نکتہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے آدم کو اپنے علم کا کچھ حصہ عطا کیا، جس کو بطور علامت تمام اشیاء کے نام کے طور پر بیان فرمایا۔ یہ علم فرشتوں کے پاس نہیں تھا۔ گویا اس علم کی وجہ سے ہی آدم فرشتوں سے برتر ہوا اور جبھی اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی تخلیق پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں کو لاجواب کردیا۔ آج دنیا میں جتنے علوم ہیں ان کی بنیاد ناموں پر ہی ہے، یعنی انسانی عقل کی ساخت اللہ تعالیٰ نے اس طرح تشکیل فرمائی ہے کہ وہ چیزوں کو نام دیتی ہے اور ناموں کی مدد سے ان کو پہچانتی ہے، ان کے خواص دریافت کرتی ہے اور افادیت معلوم کرتی ہے۔ گویا یہی وہ علم ہے جو آدم کو فرشتوں سے برتر کرتا ہے۔ مزید قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اگر ایک طرف اپنے خلیفہ ہونے کے ناطے انسان کو دنیا میں کچھ اختیارات مرحمت

فرمائے تو وہیں علم بھی عطا کردیا تاکہ وہ سمجھ سکے کہ اختیارات کو کیونکر استعمال کر کے وہ اس زمین پر عافیت سے رہ سکتا ہے۔ گویا اختیارات، علم اور بندگی کے درمیان بھی ایک توازن قائم کردیا۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب فرشتوں نے اس خلیفہ کی تخلیق کی بات سنی تو عرض کیا کہ اے اللہ تیری حمد وثناء اور تسبیح تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ یعنی تیری عبادت میں ہم سے کچھ کمی تو ہو نہیں رہی جو تو یہ ایک نئی مخلوق اور وہ بھی خلیفہ کی حیثیت سے بنا رہا ہے ۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا کہ ''میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے''۔ اس آیت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ دنیا میں انسان کو بھیجنے کا مقصد محض حمد وثناء ہی نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ اسے یہاں اپنا خلیفہ بنا کر اس سے کچھ اور بھی کام لینا چاہتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ یہ کیا کام ہے اگر ہم انسان کو زمین پر خلیفہ بنانے اور اسے علم عطا کرنے کی مصلحت پر غور کریں تو بات صاف ہوجاتی ہے۔ خلیفہ ہونے کے ناطے انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرے۔ یہ ہدایت ہمیں کلام پاک سے حاصل ہوتی ہے۔ تاہم یہاں ایک اور قابل غور نکتہ ہے جس کی وضاحت ایک مثال کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی کارخانہ یا انڈسٹری ہے اور اس کا مالک یا منیجر اپنا کوئی نائب مقرر کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کارخانے کے انتظام کو دیکھے تو وہ منیجر سب سے پہلے اپنے نائب کو اس کارخانے کے نظام کو سمجھائے گا۔ اس کا علم دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ زمین بطور امانت سونپی ہے۔ تو لازمی ہے کہ اس زمین اور اس پر کارفرما مظاہر قدرت کا علم حاصل کریں۔ یہ علم ہم کو سائنسی اور جدید علوم کو سیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کارخانے میں جاری وساری مظاہر فطرت کا علم ہی نہیں رکھیں گے تو بھلا اس کی حفاظت اور اس کا نظم کیونکر سنبھالیں گے۔ یہی وہ ''علم الاشیاء'' ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو عطا کیا تھا۔ آج اگر ہم ان سے منہ موڑتے ہیں تو کیا ہم کفران نعمت، ناشکری اور

مشیت خداوندی کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہورہے؟ کیا اس عظیم الشان کارخانۂ قدرت کا نائب یا خلیفہ ایسا ہوسکتا ہے کہ جسے اس کارخانے میں کام کررہی مشینوں اور قوتوں کا علم ہی نہ ہو؟ ہرگز نہیں ۔سچ تو یہ ہے کہ جو اس کارخانے کا علم رکھے گا وہی اس کا خلیفہ بنے گا۔شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بیشتر مقامات پر خطاب علم رکھنے والوں،عقل رکھنے والوں اور فکر کرنے والوں سے کیا ہے۔

ماحول ہماری زمین کا ایک اہم حصہ ہے،جس سے سبھی جانداروں کی صحت وسلامتی کا براہ راست تعلق ہے۔آج اس کی اصلاح کی آواز ان اقوام کی طرف سے آرہی ہے جو اگر چہ کلام پاک کی ہدایت سے محروم ہیں تاہم علم حاصل کرکے اس زمین اور اس کے ماحول کے توازن کو اور اس میں چھپی سب کی بقا کو سمجھ چکے ہیں ۔بطور خیرامت،بطور اہل قرآن ،بطور مسلم کیا ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اس اصلاح کاری میں شامل ہوں ۔اگر چہ اس کی پہل،اس کی شروعات ہماری جانب سے ہونا چاہئے تھی اور یقیناً ایسا ہوتا بھی اگر ہم اللہ کے بخشے ہوئے علوم کو ''دنیوی علوم'' کہہ کر ان سے کنارہ کش نہ ہوگئے ہوتے ،تاہم اگر ہم پہل نہ کرسکے تو لبیک تو کہہ سکتے ہیں۔
آدم کی اولاد زمین پر خلیفہ ہے لیکن ہدایت کا سرچشمہ تو ہمارے پاس ہے۔یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علوم کی مدد سے اس زمین اور کائنات کے نظام سے واقف ہوں۔کلام پاک کی روشنی اور ہدایت کی مدد سے نہ صرف اس کی اصلاح کریں بلکہ دیگر اہل علم اقوام تک یہ ہدایت بھی لے جائیں ۔یہی ہمادی ذمہ داری ہے اوراسی کام کے واسطے ہم کو اس امتحان گاہ میں بھیجا گیا ہے۔

فساد

بہت سے الفاظ کا محدود استعمال اکثر ان کی جامعیت کو ہماری نظروں سے اوجھل کردیتا ہے۔ایسا ہی ایک لفظ ''فساد'' ہے ۔جس کا مفہوم جھگڑا، دنگا،قتل وغارت گری تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔قرآن مجید میں اس لفظ کا ذکر بارہا اور مختلف انداز میں آیا ہے۔اللہ نے اسے ناپسند فرمایا ہے،نیز فساد پھیلانے والوں کو سخت عذاب کا مستحق قراردیا ہے۔لہٰذا قرآنی احکامات پر عمل کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اس لفظ کے مفہوم سے واقف ہوں۔تاکہ اس گناہ سے بچ سکیں۔

فسد الشئ کے معنی ہیں کسی چیز کا مضمحل ہوجانا۔اس کا اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہنا۔لحم فاسد اس گوشت کو کہتے ہیں جو گل سڑ کر بدبودار ہوگیا ہو اور کسی کام کا نہ رہا ہو۔
فساد درحقیقت ''صلاح'' کی ضد ہے۔صلاح کے معنی ہیں حالات کا مستقیم ومتوازن رہنا۔لہٰذا فساد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا ۔بے ترتیبی (Disorder) پیدا ہوجانا۔
(محیط،تاج،لین سے اقتباس)۔

قرآن کریم نے مفسدین (فساد پھیلانے والوں) کے مقابلے میں مصلحین کا لفظ استعمال کیا ہے:

''جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انھوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔'' (البقرہ:11)

حرث ونسل کو تباہ کردینے کو بھی فساد قرار دیا ہے:

''جب اسے اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے،کھیتوں کو غارت کرے اورنسلِ انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا''۔(البقرہ :205)

سورہ شعراء میں مسرفین کو مفسدین کہا گیا ہے:

''مسرفین (حد سے تجاوز کرنے والوں) کا حکم نہ مانو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔'' (الشعراء: 151 - 152)

اسراف کرنے والوں کو مسرفین کہا جاتا ہے۔اَلسَّـرَفَ کے معنی ہیں جو حد مقرر کی گئی ہواس سے آگے بڑھ جانا۔زیادتی کرنا۔نادانی کرنا (ابن فارس)۔سورہ الفرقان میں خرچ کے تعلق سے یہ لفظ قَتَرَ کے مقابلے میں آیا ہے۔(الفرقان:67)

قَتَـرٌ ۔بخل اورخرچ میں تنگی کو کہتے ہیں ۔لہٰذا اسراف،تفریط کے مقابلے میں افراط ہوگی۔یعنی جس مقام پر جس قدر ضرورت ہو وہاں اس سے زیادہ خرچ کردینا، غیر متوازن خرچہ کرنا۔اس لیے کہتے ہیں''سَـرَفَتِ الْاُمُّ وَلَدَهَا '' ماں نے اپنے بچے کو بہت زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کردی (تاج العروس سے اقتباس)۔اس سے اسراف کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اس طرح ضائع ہوجانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو۔چنانچہ سَرَفُ الْمَاءِ اس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر اس طرح بہہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ بیکار چلا جائے (تاج العروس) ۔گویا اسراف صرف بیجا(فضول خرچی) ہی کو نہیں کہتے۔اس سے مطلب یہ ہے کہ انسانی توانائی، وقت، دولت یا کسی اور صلاحیت (بمع علم) کو ایسے مقصد کے لیے خرچ نہ کرنا جس سے تعمیری نتیجہ سامنے آئے بلکہ اسے بے مقصد و بے فائدہ (یا برائے تخریبی مقصد) ضائع کردینا۔

جب کسی بھی چیز میں عدم توازن کی وجہ سے پیدا ہونے والا بگاڑ،خرابی ،فساد کہلاتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ زمین ، فضا اور پانی میں پھیلی کثافت اورآلودگی کو ہم فساد نہ مانیں؟ آج نہ تو پانی اپنی اصلی حالت میں ہے نہ زمین ، نہ فضاء اور نہ اس میں موجود ہوا اپنی اصلی حالت میں ہے ، نہ پہاڑ اور سمندر۔کسی چیز کا اصلی حالت پر باقی نہ رہنا فساد ہے تو پس یہ بھی فساد ہے اور اس کو پھیلانے والے مفسد ہیں۔آج ہمارے بیشتر دریاؤں کا پانی فاسد ہوچکا ہے کیونکہ وہ بدبودار بھی ہے، زہریلا بھی ہے اور کسی کام کا بھی نہیں ہے۔

''خشکی اورتری میں فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا،شاید کہ وہ باز آجائیں'' (الروم:41)

آج انسان کے ہی ہاتھوں اورانسان کے کرتوتوں کی وجہ سے انسانیت ہی نہیں بلکہ تمام جاندار آلودگی کے بھنور میں پھنس چکے ہیں۔تاہم ہماری اکثریت اس طرف سے غافل ہے۔کم علمی، ناواقفیت اور جہالت کے باعث ہماری اکثریت ان مسائل سے ناواقف ہے۔ دین کو مذہب کی شکل دے کر اسے چند ارکان میں محدود کردیا گیا ہے۔خیر اُمت ہونے کے ناطے،''مسلم'' ہونے کے ناطے کیا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم دنیا میں پھیلنے والے ہر فساد کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کریں؟ یہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔'' (الاعراف:86)

کثافت ، آلودگی، گندگی بھی فساد کی ایک شکل ہے۔ اسراف بھی فساد ہے۔آج ان برائیوں میں ہماری اکثریت مبتلا ہے۔ایک طرف آلودگی کی وجہ سے فضا بوجھل ہے تو دوسری طرف اسراف کی وجہ سے معاشرے میں زبردست ناہمواری پیدا ہورہی ہے۔

ہمارے مال وہاں خرچ نہیں ہورہے ہیں جہاں ان کی ضرورت ہے، ہماری توانائی اور صلاحیتیں اس راہ پر صرف نہیں ہورہیں جہاں انھیں صرف کرنا چاہیئے۔ ہمارا وقت، ہماری علمیت اور ہماری دانائی بھی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کی جارہی ہے جس مقصد کے واسطے یہ ہم کو عطا کی گئی تھی۔ ہم آج نہ صرف مال کا اسراف کررہے ہیں بلکہ وقت ،توانائی ، صلاحیت، علمیت اور دانشمندی کے اسراف کے بھی مرتکب ہورہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسرفین کو مفسدین کہتا ہے کیونکہ ان کی حرکتوں کی وجہ سے مختلف انداز کا فساد پھیلتا ہے۔اللہ تعالیٰ نہ تو مفسدین کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی ان کا انجام بخیر ہوتا ہے۔آج ضرورت ہے کہ ہمارے علماء واعظ اور خطیب اس طرف توجہ فرمائیں اور مسلمانوں کو آگاہ کریں کہ دین کی بلند وبالا ومستحکم عمارت کو چھوڑ کر انھوں نے مذہب کے جن ستونوں سے اپنے آپ کو باندھ لیا ہے، وہ نہ تو نجات کا راستہ ہے نہ ہی خیر اُمت کے شایانِ شان ہے۔بے روح ارکان فکروعمل کی جوالا بھڑکانے سے قاصر ہیں۔ یہ ظاہری انفرادیت اور جذباتیت تو پیدا کرسکتے ہیں لیکن وہ ''مسلم'' پیدا نہیں کرسکتے جو قوموں کی امامت کرتے ہیں۔ ارکان میں روح پھونکنے کے لیے دین کی مکمل سمجھ اور اللہ کی مکمل بندگی لازمی ہے جو قرآن فہمی اور علوم سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم نہ تو فساد کے مکمل مفہوم سے واقف ہیں نا مفسد کے۔ایسے میں ہمیں کب خبر ہوگی کہ ہم بھی مفسدین کے زمرے میں شامل ہوچکے ہیں۔مسلم کا تو یہ انداز ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کے فساد پر اس کی گہری نظر ہو اور وہ اس کا سدباب کرنے کے لیے احسن طریقے تلاش کرے اور سبھی انسانوں کی رہنمائی کرے۔آج ہماری بیشتر بستیاں گندگی کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں، ہمارے علاقوں میں گھروں اور دُکانوں کا کوڑا کرکٹ گھروں اور دُکانوں کے باہر ڈالا جاتا ہے، محلّوں کی نالیاں غلاظت سے سڑتی رہتی ہیں۔ ہم پٹریاں لگا کر، دکانیں آگے بڑھا کر راستوں کو تنگ کردیتے ہیں۔ راہ گیروں کو چلنے میں دشواری

پیدا ہوتی ہے ہم راستوں میں مزید دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ نئے نئے انداز کے فساد پیدا کرتے ہیں۔گلی گلی ، محلے محلے چلنے والے کارخانوں سے خارج ہونے والا دھواں اور گندگی پورے علاقے کو متاثر کرتی ہے۔ کاش ہم سمجھیں کہ یہ اللہ کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی ہے۔قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق اس کی ایک آیت ہے۔ یہ پانی، یہ ہوا، یہ زمین اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کی آیات ہیں۔ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ان آیات کو ناپاک کرتے ہیں، ان کی بے حرمتی کرتے ہیں ان کو نجس کرتے ہیں۔اے پروردگار ہمیں ہدایت دے، ہمیں دین کی مکمل سمجھ دے تاکہ ہم ایک خیر اُمّت کے طور پر اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ (آمین)

تقلید مسرفین کی

آج جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں وہ یا تو صاف پانی کی بوتلیں خرید کر پانی پیتے ہیں یا پھر گھر میں کوئی اچھا فلٹر پانی صاف کرنے کے لیے لگاتے ہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے وہ گندے زہریلے یا جراثیم سے پُر پانی کو مجبوراً ضرورت کے تحت پیتے ہیں۔ جب تک جسم میں قوت مدافعت ہوتی ہے ان زہروں سے لڑتے ہیں اور جب قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے تو بیمار ہو کر اسپتال کی راہ لیتے ہیں۔ کہیں کہیں (بلکہ اب تو ملک کی بیشتر ریاستوں میں) یہ زہریلا پانی بھی دستیاب نہیں ہے۔ دریا، ندی، نالے خشک ہیں، زمین کے اندر پانی ہے نہیں، آسمان پر سورج ہے پیروں تلے خشک زمین، جسم لاغر ہیں، ذہن ماؤف ہو چکے ہیں، آنکھوں کا پانی سوکھ چکا ہے۔ کون کب تک اور کس کس کو روئے۔ تڑپنے سسکنے کا، دفن کرنے کا، جلانے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔

ہماری ''ترقیات'' کا یہ ثمرہ جسے ہم کثافت (Pollution) کہتے ہیں اس کا زہر صرف پانی تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہمارے شہروں کی ہوا اس حد تک زہریلی ہو چکی ہے کہ ہر بڑے شہر کی نصف سے زیادہ آبادی کسی نہ کسی سانس کی تکلیف کا شکار ہے۔ تازہ ہوا اتنی عنقا ہوتی جا رہی ہے کہ اب صاف آکسیجن مہیا کرنے کے واسطے ''آکسیجن بار'' قائم ہو رہی ہیں جہاں آپ قیمت ادا کر کے صاف ستھری خالص ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر سکتے ہیں۔ ہوا اور پانی میں بھرا یہ زہر زمین میں بھی سرایت کر چکا ہے۔ کیمیائی

کھادوں کے غیر متوازن استعمال اور کیڑے مار دواؤں کے بے تحاشہ چھڑکاؤ نے بہت سی ریاستوں کی زمین زہریلی کر دی ہے۔ یہ زہریلے مادے کم و بیش ہمارے کھانے پینے کی ہر چیز میں کسی نہ کسی مقدار میں موجود ہیں۔

اگر ہم اپنے ماحول میں پھیلنے والے اس زہر کی سوتوں کو ٹٹولیں تو سب کا سلسلہ مادّہ پرستی کے کنویں سے جا ملتا ہے۔ ذرا تجزیہ کیجئے پانی زہریلا کیوں ہوا۔ صنعت کار نے کارخانہ لگایا، نفع زیادہ حاصل ہو اس لیے کم معیاری خام مال استعمال کیا جس نے زیادہ فضلہ پیدا کیا۔ فضلہ کو صاف کرنے یا محفوظ جگہ پر منتقل کرنے میں پیسہ خرچ ہوتا جس سے لاگت بڑھتی نفع کم ہوتا اس لیے کارخانے کا فضلہ کھلی جگہ میں، بہتے پانی، صاف ستھری ہواؤں میں خارج کر دیا گیا۔ کون دیکھنے والا ہے۔ کون پوچھنے والا ہے۔ یہ فضلہ ان کیمیائی مادوں کا تھا جن کو کوئی قدرتی ایجنسی کوئی جاندار تحلیل نہیں کرتا۔ بھلا کوئی آپ کے زہر کو کیوں پیئے۔ ان کارخانوں میں کام کرنے گاؤں و دیہات سے بھاگ کر مزدور آئے، اپنے کھیت چھوڑ کر آئے کہ وہاں آمدنی کم اور غیر یقینی تھی۔ یہاں ماہانہ تنخواہ تھی، شہر کی چمک دمک تھی تاہم شہروں میں بسنے کو نہ تو جگہ تھی نہ ان کے پاس قوتِ خرید تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی، ڈیرا ڈال کر رہ گیا۔ روز صبح آس پاس کی کھلی جگہ میں رفع حاجت کر لی۔ پوری علاقہ ایک کھلا بیت الخلاء بن گیا۔ غلاظت کے جراثیم زمین اور پانی کو متاثر کرتے رہے۔ ان لوگوں کو زمین میں گڈھا بنا کر ایک کمیونٹی لیٹرین بنانے کا تصور دینے والا کوئی نہ تھا۔ نہ ان کو یہ خیال تھا کہ وہ جو اس طرح یہ غلاظت پھیلا رہے ہیں تو کوئی ان سے اس کا حساب بھی لے گا۔ سلسلہ جاری رہا، کارخانے بنتے رہے۔ اور ان کارخانوں میں بنا کیا؟ تھوڑا سا ضروری سامان اور بقیہ وہ اشیاء جو مسرفین کے نظام کو مستحکم کرتی ہیں اور جو اگر کسی گاؤں یا قصبے میں نہ ہوں تو نہ تو کوئی بھوکا مرتا ہے اور نہ پیاسا۔ غیر ضروری، غیر اہم اشیاء کا ڈھیر تھا، نت نئی چیزیں تھیں جن کا استعمال ٹیلی ویژن

کی مدد سے لوگوں کو سکھایا جا رہا تھا۔مسرفین کے امام کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے
چھوٹے بڑے مسرفین اس جادو بھری دنیا میں جانے اور بہتر جگہ پانے کی کوشش میں
بے تحاشہ بھاگنے لگے کہ جس میں بیت الخلاء بھی ایک اور ''قابل آرائش کمرہ'' تھا۔
ہر کام بٹن سے ہوتا تھا۔غسل خانے سے لے کر کچن تک انواع واقسام کی چیزیں تھیں۔
جن حماموں میں صابن کی ٹکیاں، مٹی کا جھانواں اور بالٹی ڈونگا نظر آتا تھا۔وہاں باتھ
ٹب، انواع واقسم کے چمکدار فوارے اور نل، باتھ شیمپو، باڈی شیمپو، ہیئر
شیمپو، کنڈیشنر، باڈی جیل، ہیئر جیل، باڈی لوشن، ہیئر ٹانک، باڈی موائسچرائزر اور نہ
جانے کیا کیا نظر آنے لگا۔اگر چہ کھال کی بیماریوں اور الرجی میں اضافہ ہوا تاہم اس
کے لیے بھی عمدہ دوائیں اور اسپتال تھے۔ان چیزوں کے لیے پیسہ ہر طریقے سے
حاصل کیا گیا۔جائز بھی ناجائز بھی۔البتہ یہ کسی نے نہ سوچا کہ اگر آمدنی جائز ہے تو
استعمال ناجائز۔مندر اور کلیسا تو چپ تھے ہی، منبر بھی خاموش رہا۔ترقی کی اس چمک
دمک میں چندھیائی آنکھوں سے قرآن کریم کی آیات اوجھل ہونے لگیں۔اللہ کا حکم تھا:

(ترجمہ)''پس اللہ سے ڈرو اور اطاعت کرو۔بیجا حد سے گزرنے والوں
(مسرفین) کی اطاعت سے باز آجاؤ جو زمین میں فساد پھیلا رہے ہیں اور اصلاح نہیں
کرتے''(الشعراء:150-152)

ہم مسرفین کی ہی اطاعت کرتے رہے۔منہ سے اللہ کی بندگی کا اعلان تھا، رسول
سے محبت کا دم بھرتے تھے۔اطاعت طاغوتی نظام کی چلتی رہی۔اللہ مفسدین کو ناپسند کرتا
ہے۔ہم ہر طرح کا فساد پھیلاتے رہے اور پھیلتا دیکھتے رہے۔کہیں سے اس برائی کے
خلاف آواز نہ اٹھی جب کہ ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے تم
نیک باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''
(آل عمران:110)۔ہم نے نیک باتوں کو''ذکر''،تسبیح اور مصلیٰ تک محدود کرلیا اور سمجھ لیا۔

دنیا میں فساد پھیلتا رہا ہمارا ''ذکر'' جاری رہا۔قرآن کریم کے احکامات ہمارے لیے
معدوم ہوتے گئے۔ہم نے اس کتاب سے نصیحت لینا چھوڑ دیا جس کے لیے رب
العزت نے فرمایا''یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب تا کہ وہ ہر اس
شخص کو خبردار کردے جو زندہ ہو''(یٰسین:69-70)۔اے کاش ہم زندہ ہوتے تاکہ
اس نصیحت کی کتاب سے سبق لیتے اور دنیا کو بھی ہدایت کا راستہ عملاً دکھاتے۔آج کروڑ ہا
کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایک معاشرہ، کوئی ایک سماج، کوئی ایک ملک ایسا نہیں جو قرآنی
نظام عدل وتوازن کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنا ترقیاتی ماڈل تیار کرتا اور دنیا کو دکھا دیتا کہ
کس طرح ماحول کی حفاظت کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی بھی ممکن ہے۔ایک ایسی سچی
ترقی جس کے نتیجے میں ہر بھوکے کے پاس کھانا، مفلس ومسکین کو سہارا، ہر کمزور کو محافظ
اور پریشان کو آرام نصیب ہوتا ہے۔سچ ہے ہم نے قرآن کریم کو پیچھے ڈال دیا ہے، چھوڑ
دیا ہے۔نشانہ تضحیک بنالیا ہے مہجور کردیا ہے۔(الفرقان: 30)۔

نظامِ زکوٰۃ

بنگلہ دیش کے محمد یونس اوران کے گرامین بینک کونوبل انعام برائے امن (2006) ملنے کی خبر ہم نے پڑھی اور دیگر خبروں کی طرح یہ بھی ایک خبر ہی رہی۔ کچھ حلقوں نے اس بات پر خوشی منالی کہ ایک مسلمان کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ آیئے ذرا یونس صاحب کی کوششوں کا کچھ گہرائی سے جائزہ لیں۔ گرامین بینک کے تحت انھوں نے مالی وسائل غرباء اور خصوصاً عورتوں تک پہنچانے کا ایک مؤثر نظام قائم کیا۔ اس سرمائے کی مدد سے غرباء نے اپنے لیے روزگار کا انتظام کیا اور ان کی حالت سدھری —— آج جس بنیادی کام کواس حدتک سراہا گیا کہ اس کو ''قیامِ امن'' کا ایک طریقہ سمجھا گیا اورنوبل انعام عطا کیا گیا وہ وسائل کی ہموار یا متوازن تقسیم کی سمت ایک کوشش تھی۔ وسائل کی ناہموار تقسیم ہی سماج میں فساد وانتشار کی وجہ بنتی ہے اور امن وامان کو برباد کرتی ہے۔ اسی فساد کے تدارک کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال کو جمع کرنے کی تنبیہ فرمائی ہے (الھمزہ:1-3) نیز زمین کی ہر چیز پر سب انسانوں کے اجتماعی حق کا حکم دیا ہے (البقرہ:29)۔ وسائل کی متوازن تقسیم کے واسطے ہی ربِّ کریم نے زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔

زَکَا کے بنیادی معنی نشوونما پانا، بڑھنا، پھولنا، پھلنا ہیں زَکَا اَلْمَالُ وَالزَّرْعُ ۔یَزْکُوْ۔زُکُوًّاو اَزْکیٰ ۔ جانوروں کا اورکھیتی کا پھلنا، پھولنا، بڑھنا، نشوونما پانا۔

اَزْکیٰ اللّٰہُ الْمَالَ وَزَکَّاہُ۔ خدا نے مال کونشوونما دی۔ بڑھایا۔ زَکَا الرَّجُلُ یَزْکُوْ ۔ آدمی آسودہ اور خوشحال ہوگیا۔ اس کی صلاحیتوں میں نشوونما آگئی، اس کی زندگی سر سبزوشاداب ہوگئی (تاج نیز ابن قتیبہ: القرطین ج/1 صفحہ 62) ۔ راغب اصفہانی نے اس کی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے: فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَا اَزْکیٰ طَعَاماً (الکھف:19) یعنی یہ دیکھو کہ کون سا کھانا خوش انجام ہے، اس میں نشوونما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے یعنی غذائیت سے پُر (Nutritious) ہے۔

تاج العروس کے مطابق اَلزَّکٰوۃُ کے معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، پھلنا، پھولنا۔ اس کے معنی پاکیزگی کے بھی آتے ہیں لیکن یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہیں۔ خود قرآن کریم میں ایک ہی آیت میں اَزْکیٰ اور اَطْھَرُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں۔ اَزْکیٰ لَکُمْ وَاَطْھَرُ (البقرہ:232)۔ اس میں اَطْھَرُ تو پاکیزگی کے لیے ہے اور اَزْکیٰ نشوونما کے لیے۔ صاحبِ محیط نے بیضاوی کے حوالے سے اَلزَّکِیُّ کے معنی لکھے ہیں خیر وخوبی کے ساتھ بڑھنے والا۔ عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر (دور) سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا، یعنی اس میں بالیدگی اور ارتقاء کا پہلو مضمر ہے۔ اَرْضٌ زَکِیَّۃٌ کے معنی ہیں سرسبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو۔ اَزْکیٰ کے معنی ہیں اَنْفَعُ ۔ زیادہ منفعت بخش۔ اسی اعتبار سے زَکَاً اس عدد کو کہتے ہیں جو زوج (جوڑا) ہو۔ (محیط نیز ابن فارس)۔ سورہ کہف میں ہے کہ خدا انھیں ایسا بیٹا دے گا جوان کے پہلے بیٹے کے مقابلے میں زیادہ صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔ ''خَیْراً مِنْہُ زَکٰوۃً (81)۔ نَفْساً زَکِیَّۃً (الکھف:74) کے معنی ہیں اچھا، عمدہ جوان، نشوونما یافتہ لڑکا۔ سورہ الشّمس میں زَکّٰھَا کے مقابلے میں دَسّٰھَا کا لفظ آیا ہے (9-10) تَدْسِیَۃٌ کے معنی ہوتے ہیں دبا دینا، کسی کو زندہ دفن کردینا (النحل:59) گویا اس کی نشوونما کو روک دینا۔

قرآن کریم میں ''ایتائے زکوٰۃ'' کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا اور

زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما یعنی نوع انسانی کی نشوونما (Development) کا سامان بہم پہنچانا، اس کا انتظام کرنا، اس ''ڈیولپمنٹ'' یا'' نشوونما'' میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں شامل ہیں۔قرآن کریم جب جماعت مومنین کو ایتائے زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے تو وہ انھیں افرادِ معاشرہ اور دیگر نوع انسانی کی نشوونما کا حکم دیتا ہے۔ان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے لیے ان تک مادّی وسائل کا پہنچانا بھی حکم الٰہی ہے۔ گویا قرآن کریم ایک طرف ہم کو مال جمع کرنے سے منع کرتا ہے (الھمزہ: (1- 3)۔ مال خرچ ہوجانے پر مفلسی آنے کے خوف کا تدارک اس یقین دہانی کے ساتھ کرتا ہے کہ ''شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور اللہ اپنے فضل کا یقین دلاتا ہے'' (البقرہ:268) تو دوسری طرف مال کو انسانوں کے نشوونما کے لیے استعمال کرنے کے واسطے ایتائے زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ مستحقین کی طبعی زندگی کی نشوونما کے لیے مال کو ان پر کس طرح خرچ کیا جائے۔ اگر زکوٰۃ کو بھی خیرات یا صدقہ کی طرح ضرورت مندوں کو دے دیا جائے تو ان کی وقتی ضروریات تو شاید پوری ہوجائیں لیکن وہ صاحبِ روزگار نہ ہوسکیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ان کے واسطے روزگار کا انتظام اس شکل میں کیا جائے کہ وہ پھر اپنی محنت سے اللہ کا فضل حاصل کرسکیں تو یہی ان کی طبعی نشوونما ہوگی۔ یعنی عین زکوٰۃ ہوگی۔اس کے لیے لازم ہے کہ اہل ثروت اپنے سرمائے سے مستحقین، مفلسین اور مساکین کے لیے اپنے اپنے علاقوں اور ان کی ضروریات کے مطابق انتظام کریں۔ مثلاً دیہی علاقوں میں ضرورت مندوں کو کھیتی کے واسطے آراضی مہیا کی جاسکتی ہے، چھوٹی صنعتیں قائم کرنے کے لیے آراضی اور سرمایہ فراہم کیا جاسکتا ہے جو ان کی مشترکہ ملکیت ہو یعنی ایک طرح کا کوآپریٹو (Co-operative) انتظام۔ یہ ''زکوٰۃ کوآپریٹیوز'' (Zakat Co-operartives) یا تو ان سے استفادہ حاصل کرنے والے خود چلائیں یا اگر ان کی علمی یا تجرباتی صلاحیت

اتنی نہیں ہے تو عطا کنندگان میں سے ہی کوئی فرد یا کمیٹی اس کی نگراں ہوسکتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصبات یا دیہات میں آراضی پر کھیتی یا باغات، فارمنگ، جام جیلی اچار چٹنی شربت بنانے کی یونٹ، مقامی ضروریات کو پوری کرنے والی بیکریاں جو بسکٹ، ڈبل روٹی وغیرہ بنا کر وہاں کے مقامی باشندوں کی ضروریات پوری کرسکیں، مقامی کرگھا اور کپڑا گھر، مشین سازی اور مشین مرمت کے مراکز اور اسی انداز کی دوسری صنعتیں یا شہروں سے سستے دام زیادہ مقدار میں مال لاکر اس کی تقسیم کاری (Distribution) اور اس سے ہونے والی آمدنی کو آپریٹو کی آمدنی۔ اس طرح نہ صرف مستحقین کے واسطے روزگار اور نشوونما کا انتظام ہوگا بلکہ وہ جب اپنی مقامی ضروریات کو ازخود پورا کریں گے تو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعہ سپلائی کردہ مال کی گرفت سے بھی نکلیں گے اور ان منافع خوروں اور انسانیت کا استحصال کرنے والوں کے کاروبار کو بھی کمزور کریں گے کیونکہ ان کا منافع سرمایہ داری کے نظام کو مضبوط کررہا ہے۔ اس طرح نظام زکوٰۃ قائم کرنے کے ہمہ گیر فوائد ہوں گے جو ایک بہتر معاشرہ قائم کریں گے۔ یہی وہ عملی نمونہ ہوگا جو دیگر افراد کو دین اسلام کی افادیت سے روشناس کرائے گا اور حق کی طرف آنے کی دعوت دے گا۔

کتابِ عالم سے سبق

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار ہا تلقین کی ہے کہ انسان اس کی قدرت کے مظاہر کو دیکھے، انھیں سمجھے اور ان پر غور وفکر کرے، تدبر کرے۔ انھوں نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ ایسی بیشتر آیات کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شاید تم فلاح پاسکو۔ یعنی مظاہر قدرت کو دیکھ کر ان پر غور وفکر کر کے تم جن نتائج پر پہنچو گے ان سے ممکن ہے تم فلاح کا راستہ پاسکو۔ اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ قادرِ مطلق جسے محض ”کن“ کہنے کی دیر ہوتی ہے کہتا ہے کہ ”شاید“ تم فلاح پاؤ— یعنی ان مظاہر کو دیکھنے اور ان پر غور وفکر کرنے والا ہر نفس فلاح نہیں پائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی تخلیقات کو ”آیات“ کا نام دیا ہے۔ آیئے پہلے یہ سمجھیں کہ عربی زبان کا یہ نہایت جامع لفظ کیا معنی رکھتا ہے۔ آیت کا مادّہ ”ای ی“ پر مشتمل ہے۔ راغب، تاج ومحیط کے مطابق آیۃ ظاہری علامت کو کہتے ہیں۔ ہر اس ظاہر شئے کو کہتے ہیں جو کسی چھپی ہوئی چیز کا لازمی خاصّہ ہو اور جب کوئی شخص اس ظاہری چیز کا ادراک کرلے، اسے سمجھ لے تو وہ جان لے کہ اس نے اس پوشیدہ شئے (کہ جس کی نشانی وہ ”آیۃ“ تھی) کا ادراک یا اندازہ کرلیا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسانی ادراک کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ انسان کی سمجھ اور اس کا علم محدود ہے محض اتنا ہی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا ہے۔

یہاں اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ عطا سے مراد یہ نہیں ہے کہ کس کو ”کتنا“ علم عطا کیا ہے۔ ورنہ یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ”عالم“ کو زیادہ علم دیا اور ”جاہل“ کو بالکل نہیں دیا۔ گویا ”بے چارے“ جاہل کے ساتھ نعوذ باللہ ناانصافی ہوگئی کہ وہ علم سے محروم کردیا گیا۔ قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں علم رکھ دیا ہے یعنی ہر انسان کو علم حاصل کرنے کی صلاحیت عطا کردی گئی ہے۔ اب جو کوئی اس صلاحیت کو استعمال کر کے جتنا علم حاصل کرتا ہے وہ اسی درجے کا عالم بنتا ہے اور جو ان صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا، بروئے کار نہیں لاتا وہ جاہل رہ جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال اُٹھایا جاسکتا ہے کہ ایک بے حد غریب مزدور گھرانے میں پیدا ہونے والا بچہ کیونکر علم حاصل کرے گا کیونکہ وہاں تو نہ ماحول ہے نہ حالات سازگار ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل ایسے گھرانے کی اس غربت کی ذمہ داری اس سماج کی ہے کہ جس میں معاشی ناہمواری اور وسائل کی غیر حقیقی (یعنی غیر قرآنی) تقسیم کے نتیجے میں چاروں طرف مالدار گھرانوں کے درمیان ایسے غریب اور مفلوک الحال کنبے موجود ہیں کہ جہاں تحصیل علم دشوار ہے۔ دوم یہ کہ ان گھرانوں کے افراد کو اگر علم کا ذوق ہے تو یہ بات دیکھی جائے گی کہ انھوں نے اور ان کے بچوں نے علم حاصل کرنے کے لیے کیا حتی الامکان کوشش کی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان کو علم کی اہمیت کا ہی اندازہ نہ ہو؟— اس کی ذمہ داری بھی اس معاشرے پر ہے جس کا وہ حصہ ہیں۔ اس معاشرے کے باعلم حضرات اگر علم کی اہمیت اس کے صحیح پیرائے میں عوام کے سامنے رکھیں گے تو ان کو اس کی اہمیت کا احساس ہوگا اور وہ اسے ایک دینی فریضے کی طرح اہمیت دیں گے۔ تاہم اگر علم کو محض حصولِ روزگار کا ذریعہ سمجھا جائے گا (جیسا کہ ہمارے ایک طبقے میں تصور ہے) تو لوگ روزگار کے ”دیگر“ ذرائع اپنا کر علم سے دامن بچائیں گے۔ اگر دین

کوعلم سے الگ کر کے پیش کیا جائے گا (جیسا ہمارے بقیہ ماندہ طبقے میں تصور ہے) تو لوگ بھرپور''دین دار'' بنیں گے لیکن علم وعرفان سے دور ہوں گے۔مزید یہ کہ جولوگ علم کو روزگار کے لیے حاصل کرتے ہیں وہ علم کے اس حقیقی اور اصلاحی پہلو سے ناواقف رہتے ہیں کیونکہ کوئی ان کو علم کے اس پہلو سے واقف نہیں کراتا۔ یہاں بھی ذمہ داری ان واقفین کی ہی ہے کہ وہ علم کی حقیقت سے عوام الناس کو روشناس کرائیں۔لہٰذا یہاں عطا سے مراد وہ مکمل علم ہے جو اللہ نے نسل انسانی کی سرشت میں داخل کردیا ہے۔

چونکہ محدود، لامحدود کا احاطہ نہیں کرسکتا لہٰذا انسانی علم وبصیرت بھی اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کا ادراک نہیں کرسکتی۔ رب العزت کی قدرت وحکمت کا اندازہ ان ظاہری علامات سے ہی لگایا جاسکتا ہے جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ اسی لیے یہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء آیات اللہ کہلاتی ہیں۔ وحی اللہ کی نشانی ہے،لہٰذا آیت اللہ ہے۔قرآن مجید کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔اس اعتبار سے پیغام (رسالت) کو بھی آیت کہتے ہیں(لیکن) قرآن مجید میں کئی مقام پر اسی انداز سے''آیت'' کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً جب حضرت صالح نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم قانون خداوندی کا احترام کرتے ہو یانہیں، میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس اونٹنی کو کھلا چھوڑ دوں، اس تذکرے میں اونٹنی کو آیت کہا گیا۔ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ** آیة (الاعراف 73)''یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے''۔اسی طرح حضرت نوحؑ کی کشتی کو بھی آیة **للعالمین** (العنکبوت:15) کہا گیا۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہروہ محسوس شئے جو انسان کی توجہ اللہ اور اس کے قوانین کی طرف موڑ دے، آیۃ اللہ ہے۔

آیت کے مفہوم کے تعلق سے دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیت ایک ایسی ظاہری نشانی ہے جس کا ''ادراک'' کرکے انسان اس پوشیدہ شئے کا ادراک کرسکے کہ جس کی یہ نشانی ہے۔ لہٰذا اللہ کی آیات (نشانیوں) کا ادراک کرنے کے بعد ہی ہم

اللہ کا ادراک کرسکتے ہیں۔اب اگر ہم نے آیات کا ہی ادراک نہ کیا تو نہ تو آیۃ کا حق ادا کیا نہ اس سے وہ فیض و ہدایت حاصل کی کہ جس کے واسطے رب کریم نے ہمیں اس آیۃ کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ کائنات کے طول وعرض میں پھیلی اللہ کی آیات کا ادراک علم کی مدد سے ہی ہوسکتا ہے لہٰذا آیت کا حق ادا کرنے کے لیے علم کی واقفیت ضروری ہے۔اشیاء سے واقف کرانے والے علم کو ہی ہم سائنس کہتے ہیں۔ یہی وہ علم الاشیاء ہے جو نسل آدم کو عطا کیا گیا ہے۔عربی زبان کی لغات بھی علم کا ترجمہ سائنس اور عالم کا ترجمہ سائنسداں کرتی ہیں۔ یہی وہ علم اور واقفیت ہے کہ جس کو رکھنے والے اللہ سے ڈرتے ہیں (فاطر:28) کیونکہ اللہ کی تخلیقات سے واقفیت ان کو اللہ کی عظمت وحکمت سے واقف کراتی ہے۔شرط یہ ہے کہ اللہ کی تخلیقات سے واقفیت حاصل کرنے والا، ان آیات الٰہی کا مشاہدہ وتجزیہ کرنے والا اس کا بندہ ومومن ہو۔آج صورت حال یہ ہے کہ جو لوگ علم وتحقیق کے میدان میں سرگرم ہیں ان کی اکثریت نہ تو مومن ہے اور نہ ہی قرآنی تعلیم سے واقف ہے۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ یا تو قرآن فہم نہیں ہیں یا علم الاشیاء ان کے دین کے دائرے میں نہیں ہے۔ لہٰذا وہ علم سے دور اور آیات سے غافل وبے بہرہ ہیں۔ ایسے میں لازم ہے کہ عوام کے سامنے علم کی صحیح شکل پیش کی جائے ۔ بظاہر ہم کو علم کی اہمیت کا احساس ہو چلا ہے۔تعلیم کے چرچے عام ہو رہے ہیں۔ تاہم اگر ہم نے اس تعلیم کا مقصد محض روزگار یا ایک سماجی حیثیت پانا ہی سمجھا تو ایسی تعلیم سے کچھ مزید مادّہ پرست افراد تو پیدا ہوجائیں گے، حقیقی اصلاح کا کام کبھی نہ ہوسکے گا۔ برخلاف اس کے اگر ہم کائنات اور اس کے اسرار سمجھنے کے لیے علم حاصل کریں گے، اس علم کی مدد سے قرآنِ مجید پر غور وفکر کریں گے، آیات اللہ پر تدبر وتفکر کرکے ہدایت حاصل کریں گے تو نہ صرف ایک اچھے فرد بنیں گے بلکہ اپنے سماج کے لیے بھی نافع ہوں گے۔ اس انداز سے حصولِ علم کرنے والے نہ صرف یہ کہ اچھے فرد

ہوں گے بلکہ اپنی علمیت کی وجہ سے برسرِ روزگار بھی ہوں گے۔ معاملہ علم کو ''کافر'' اور ''مسلم'' بنانے کا نہیں اس نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کا ہے جس کے ساتھ علم حاصل کیا جا رہا ہے یا اس کی تعلیم دی جارہی ہے۔ کسی عمدہ چیز کو دیکھ کر ایک عام ذہن اس چیز کی تعریف کرتا ہے یعنی اس کی نظر اس ''تخلیق'' پر رک جاتی ہے جبکہ اسی چیز کو دیکھ کر ایک مسلم ذہن نہ صرف چیز کو سراہے گا بلکہ خالق کی حکمت اور خلاّقی کا بھی قائل ہوگا یعنی اس کی نظر تخلیق کے ذریعے خالق تک جائے گی۔ آیت اللہ کے ذریعے اللہ تک جائے گی۔ بس یہی فرق ہے جس کو ہمیں سمجھنا ہے اور علم کے حصول کے لیے مسلم نقطۂ نظر اپنانا ہے۔ اس انداز سے حاصل شدہ علم کی مدد سے جب ہم کتابِ عالَم میں اللہ کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں سبق بھی ملتا ہے اور ہدایت بھی۔

پہلا سبق: بندگی

اگر ہم اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو اس کائنات کی ہر چیز نہایت انہماک سے اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کے مطابق اس چیز کی فطرت میں داخل کردیئے ہیں۔ مثلاً زمین ایک خاص زاویئے پر جھکی ہوئی سورج کے گرد ایک مقررہ مدار میں ایک طے شدہ رفتار سے گھومتی ہے۔ یہ اس کا کام ہے کہ اسی طرح گردش کرتے رہے لہٰذا اس کی گردش جاری ہے جس کی وجہ سے مختلف موسموں کا اور دن ورات کا آنا جانا چلتا رہتا ہے۔ اس تمام کام میں اتنا نظم اور پابندی ہے کہ ہم سورج کے طلوع وغروب کا حساب پیشگی لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہواؤں کی حرکت اللہ تعالیٰ کے طے کردہ قوانین کے تحت ہوتی ہے۔ گرم ہوا ہلکی ہونے کے سبب اوپر اٹھتی ہے، نم اور بھاری ہوا نیچے کی طرف آتی ہے، اگر کسی طرف ہوا کا دباؤ کم ہوجائے یعنی وہاں وقتی طور پر ہوا کی ''کمی'' ہوجائے تو فوراً دوسرے علاقے سے ہوا دوڑتی آتی ہے تاکہ وہ اس کمی کو پورا کرسکے۔ اس کو ہم آندھی کہتے ہیں۔ ہوا میں نمی جمع ہوکر بادل بناتی ہے جو پانی کی باریک پھواروں جیسے باریک قطروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ باریک قطرے باہم مل کر بوند بناتے ہیں تو وہ فوراً بارش کی شکل میں زمین کا رُخ کرتی ہے۔

اسی طرح نم زمین پر پڑا زندہ بیج ایک نئے پودے کو جنم دیتا ہے۔ اس کا چھلکا پانی کو جذب کرکے اپنے اندر سوئے جنین (ایمبریو) تک پہنچاتا ہے جو اپنی محفوظ غذا کو تحلیل

کر کے گلوکوز بناتا ہے اور اپنی بڑھوار شروع کر دیتا ہے۔اس کا ایک حصہ ہری کونپل پیدا کرتا ہے تو دوسرا ننھی سی جڑ۔کونپل اوپر کی طرف یعنی زمین کی کشش کے مخالف رُخ پر چلتی ہے تو جڑ زمین کے اندر کا رُخ کرتی ہے۔یہ اللہ کا قانون ہے کہ کونپل اور اس سے بنے تمام اعضاء (یعنی تنا، شاخیں وغیرہ) ہمیشہ زمین کے اوپر پھیلیں گی اور جڑیں زمین کی گہرائی میں اُتریں گی۔آپ چاہیں تو بیج کو اُلٹا کر کے دیکھ لیں وہ اللہ کے اس حکم سے نہیں ہٹے گا۔پودا لگے گملے کو آپ زمین کے متوازی لٹا دیں۔چند دن میں ہی اس کی شاخیں اوپر کی طرف مڑ جائیں گی اور جڑیں نیچے کی طرف۔ایسی مثالیں بیشمار ہیں کیونکہ کائنات میں پھیلی اللہ کی تخلیقات بیشمار ہیں اور ان کی ایک بڑی تعداد سے تو ہم واقف بھی نہیں۔یہ تمام تخلیقات عین اللہ کے حکم کے مطابق کام کرتی ہیں لہٰذا یہ ''مسلم'' ہیں اور یہی ان کی بندگی ہے۔یعنی اللہ کے احکامات کے مطابق وہ کام انجام دینا جس کے واسطے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔یہی بندگی ہے، یہی عبادت ہے، یہی اطاعت ہے۔

اللہ کی بندگی کے یہ نمونے چہار سو بکھرے پڑے ہیں۔اللہ کی تخلیقات پر غور وفکر کرنے سے، ان کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف ہمیں بندگی کے آداب و انداز نظر آتے ہیں بلکہ ہدایت بھی حاصل ہوتی ہے۔عبادت کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔اللہ کی یہ آیات، یہ تخلیقات جب اس کے احکام کی پیروی کرتی ہیں، تو راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔جڑ کا کام اگر پانی تلاش کرنا ہے تو یہ ننھی سی جان اپنے راستے میں آنے والے کنکر پتھروں کی پرواہ نہیں کرتی۔تاہم وہ ان سے الجھتی بھی نہیں، انہیں توڑتی بھی نہیں، بلکہ دائیں بائیں سے راستہ بناتی ہوئی اپنا سفر جاری رکھتی ہے حتیٰ کہ پانی سے جاملتی ہے۔راستے کی رکاوٹیں اسے روکنے میں ناکام رہتی ہیں وہ اپنی تمام تر قوت اور صلاحیت اللہ کے حکم کی تعمیل میں صرف کرتی ہے۔اگر آپ غور فرمائیں تو اللہ کی ہر آیت اسی اندازہ سے کام کرتی ہے، چاہے وہ جانور ہوں، پیڑ پودے ہوں، چاند سورج

ستارے ہوں، ریت پتھر ہوں یا آب وہوا۔ہر چیز اپنے طے شدہ دائروں میں اللہ کے احکام بجا لاتی ہے۔یہی ان کی بندگی ہے۔یہی عبادت ہے۔اللہ کی کائنات میں پھیلی آیات میں بندگی کا یہ سبق لے کر آئیے کتاب اللہ میں بندگی کا مفہوم تلاش کریں:

ابنِ فارس (**مقاییس اللغة**) کے مطابق بنیادی مفہوم کے اعتبار سے **عِبَادَةٌ** کے معنی ایسا کام کرنا ہے جو دل کے شوق اور رغبت سے انجام دیا جائے اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش ہو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو اَلذّٰرِیٰت (51) کی دو آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔پہلے فرمایا:

''وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤمِنِينَ''(55)

اللہ کے قوانین کی یاد دہانی کرتا رہ[1] (انھیں بھلا نہ دے) کیونکہ یہ یاددہانی (یعنی اللہ کے قوانین واحکامات کو یاد رکھنا، ان کی حفاظت کرنا) مومنوں کے لئے نافع ہے، فائدمند ہے۔

---

1 یہاں ''ذکر'' کے مفہوم کی وضاحت ضروری ہے۔اَلذِّکْرُ کا مطلب ہے کسی چیز کو محفوظ کر لینا۔کسی بات کا دل میں حاضر کر لینا، یہ لفظ نسیٌ کے مقابلے میں آیا ہے (الانعام:68) نَسِیٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا۔لہٰذا ذکر کے معنی ہوئے کسی بات کو یاد کرنا۔شہرت کو بھی ذکرٌ کہتے ہیں۔نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی۔شرف وعزت کو بھی اور عبرت کو بھی۔ ذکرٌ اس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں۔ یہ حفاظت کے معنی میں بھی آیا ہے۔'' اُذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ '' تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کی حفاظت کرو، ان کو ضائع مت کرو۔ (تاج العروس، المفردات فی غریب القرآن)۔قرآن کریم کو الذِّکْرُ کہا گیا ہے۔(النّحل:44) کیونکہ اس میں اقوام کے عروج وزوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی۔(باقی اگلے صفحہ پر)

پھر فرمایا

''وَمَا خَلَقتُ الجِنّ وَالِانسَ اِلّاَ لِیَعبُدُونِ (56)	میں نے تمام جنوں او رانسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔''

عبادت کرنے والوں کو ہم عابد کہتے ہیں جو کہ عبد سے بنا ہے ۔منفعت اورمشقت کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کرعبد کے معنی سمجھ میں آتے ہیں ۔تَعبِیدٌ کے معنی ہیں اونٹ (یا دیگر جانور) کوسدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا(تاج العروس ولین: Lane's Lexi con) ۔یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو ۔اسی طرح سڑک کو کوٹ کر ہموار کر دینا تا کہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں ،بھی تَعبِیدٌ کہلاتا ہے ۔ان کاموں میں ابتداً کسی قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخر میں ان کا نتیجہ فائدہ مند ظاہر ہوتا ہے ۔اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ فائدہ اجتماعی ہوتا ہے ۔اللہ کے قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے کے نتائج بھی اسی طرح خوشگوار اور نافع ہوتے ہیں خود اس فردِ واحد کے لئے بھی اور سماج کے لئے بھی ۔

لہٰذا عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو سرکش و بیباک نہ ہونے دے، بلکہ ان کو قوانین خدا وندی کے قالب میں ڈھال کر منشائے خدا وندی کے مطابق صرف کرے ۔قرآن کریم نے اُعبُدُ وُاللّٰہَ وَاجتَنِبُوُا الطّٰاغُوتَ (النَّحل:36 ۔ترجمہ: اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو) سے اس مفہوم کو

(گزشتہ سے پیوستہ)......اشیائے فطرت پر غور وفکر کرنے والوں کو لِقَومٍ یَذَّ کَّرُونَ کہا گیا ہے۔ (النحل:13) نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذکرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔یعنی ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جدوجہد جنھیں پس پشت ڈال دیا گیا ہے(طٰہٰ :34،42) ۔میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اوراس طرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذکرٌ کہا گیا ہے (الانفال:45) ۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ زندگی کے کسی گوشے میں، حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

واضح کردیا۔ طاغوتٌ کے معنی ہی سرکش قوتیں کیونکہ طَغُوَیٰ کے معنی سرکش اور حدود شکنی کے ہیں(تاج العروس،محیط المحیط ،لسان العرب)اور اسی سے لفظ طاغوت ہے جو ہر حدود شکنی نیز اللہ کے سوا ہر باطل معبود کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ طاغوت ہر اس چیز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو کسی کو سیدھی راہ سے بھٹکا کر غلط راستے پر لگادے۔ (المفردات فی غریب القرآن)۔ دوسری جگہ ہے لَا تَعبُدِ الشَّیطٰن (مریم:44)۔اس کے معنی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو۔ شیطان کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے واضح کردیا کہ''اِنَّ الشَّیطٰنَ کَانَ لِلَّرحمٰنِ عَصِیًّا (مریم:44) یعنی شیطان اللہ کے قوانین واحکامات سے سرکشی اختیار کیے ہوئے ہے۔شیطانی قوتوں میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے وہ جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت سورہ الجاثیہ کی 23ویں آیت کرتی ہے''اَفَرَ ایُتَ مَنِ اتَّخذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہٗ ......'' ترجمہ: کیا تونے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الہٰ بنالیا؟ سورہ النّحل کی 36ویں آیت میں بیان ہے کہ اللہ کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔ اس تقابل سے اللہ کی عبودیت نیز بندگی کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

دین کی بنیاد عبادت (بندگی) پر ہے ۔ اس لیے اس کا صحیح اور مکمل تصور ہمارے ذہن میں ہونا چاہئے۔عبد کے معنی غلام اور محکوم کے ہیں لہٰذا عبادت کے معنی کسی کی محکومی اور مکمل اطاعت اختیار کرنا ہوتے ہیں۔ دین اسلام کی بنیاد اسی اصول محکم پر ہے کہ اطاعت اور محکومیت اللہ کے قوانین کے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔اسی کا نام عبادت ہے اور کائنات کی ہر شئے ، اللہ کی ہر تخلیق اسی طرح بندگی کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔کیا ہماری بندگی (عبادت) اس سے مختلف اور محض ظاہری ہوسکتی ہے؟ فتدبر۔

دوسرا سبق: ہموار تقسیم

ہر جاندار کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن گیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیڑ پودوں میں یہ گیس پتیوں کے ننھے ننھے سوراخوں سے اندر جاتی ہے اور پودے کے تمام جسم میں حسبِ ضرورت پھیل جاتی ہے۔جانوروں کے جسم میں یہ خون یا اسی قسم کے موجود دیگر نظام کی مدد سے پھیلتی ہے۔خود ہمارے جسم میں بھی آکسیجن کے پھیلنے کا یہی نظم ہے۔آکسیجن غذا کو تحلیل کر کے توانائی اور فضلے میں تبدیل ہونے میں مدد کرتی ہے۔ اس عمل کے دوران کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس فضلے کے طور پر خارج ہوتی ہے۔ یہ عمل جسم کے ہر سیل میں ہوتا ہے۔ یعنی جسم کے ہر سیل کو ہمہ وقت آکسیجن بھی درکار ہوتی ہے اور کیمیائی عمل کے نتیجے میں خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بھی خارج کرنا ہوتی ہے۔ ہمارے جسم میں یہ کام خون کی مدد سے انجام پاتا ہے۔خون میں موجود سرخ مادّہ (ہیموگلوبن) دوہری صلاحیت کا مالک ہے۔حسبِ موقع یہ آکسیجن کو بھی جذب کر لیتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو بھی۔ یہ کس وقت کس گیس کو جذب کرے گا، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ایک اہم قانون کے تحت ہوتا ہے جسے ''قانون نفوذ پذیری'' (Diffusion Law) کہتے ہیں۔اس کے مطابق اللہ کی اس کائنات میں ہر شئے اپنی زیادہ مقدار والی جگہ سے کم مقدار والی جگہ کی طرف از خود سفر کرتی ہے (بشرطیکہ راستے میں کوئی رکاوٹ

حائل نہ ہو یا اس عمل کو روکا نہ جائے) اللہ کا یہ قانون کائنات میں ہر جگہ جاری وساری ہے۔ ہمارے نظام خون میں بھی یہ اپنا کام دکھاتا ہے۔خون جب پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے تو پھیپھڑوں میں تازہ ہوا موجود ہوتی ہے(جو ہمارے سانس اندر لینے کی وجہ سے پھیپھڑوں میں پہنچتی ہے)۔اس ہوا میں آکسیجن کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار نسبتاً کم ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں میں پہنچنے والا خون تمام جسم کا سفر مکمل کر کے پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے لہٰذا اس میں آکسیجن برائے نام ہی بچی ہوتی ہے کیونکہ جسم کے سفر کے دوران یہ اپنی تمام آکسیجن جسم میں بانٹ دیتا ہے۔اس کے برخلاف اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے کیونکہ جسم کے ہر سیل سے اس نے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس جمع کی ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں میں موجود تازہ ہوا میں چونکہ آکسیجن زیادہ ہوتی ہے لہٰذا یہ خون میں سرایت کر جاتی ہے۔خون میں چونکہ پھیپھڑوں میں موجود ہوا کے مقابلے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس زیادہ ہوتی ہے لہٰذا کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خون سے باہر نکل کر پھیپھڑوں میں آجاتی ہے۔اس طرح پھیپھڑوں میں دونوں گیسوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس تبادلے کے بعد خون میں آکسیجن کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور خون کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پاک ہو جاتا ہے۔اسی کو ہم ''صاف خون'' کہتے ہیں۔اب خون دل کی مدد سے پھر پورے جسم میں پھیلا دیا جاتا ہے۔خون کے سُرخ ذرّات جب جسم کے سیلوں کے پاس پہنچتے ہیں تو وہاں آکسیجن استعمال کی جا چکی ہوتی ہے(غذا کو تحلیل کرنے میں) اور کاربن ڈائی آکسائیڈ وہاں جمع ہوتی ہے۔یعنی جسم کے ہر سیل میں منظر پھیپھڑوں سے جداگانہ اور یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یہاں سیل میں آکسیجن صفر یا بہت کم اور خون میں نسبتاً بہت زیادہ ہے لہٰذا اللہ کے اسی قانون کے مطابق آکسیجن خون سے سیل میں منتقل ہو جاتی ہے۔سیل میں کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس زیادہ ہوتی ہے

بہ نسبت خون کے۔لہٰذا یہ خون میں منتقل ہوجاتی ہے۔ یہاں بھی گیسوں کا تبادلہ ہوا۔ یہ تبادلہ پھیپھڑوں میں ہونے والے تبادلے سے مختلف تھا لیکن اسی اصول پر مبنی تھا کہ ہر مادّہ اپنی زیادہ مقدار والی جگہ سے کم مقدار والی جگہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔اگر اللہ کا یہ قانون ایک لمحے کے لیے بھی کام کرنا بند کردے تو کسی بھی جاندار کا زندہ رہنا دشوار ہوجائے گا۔ہم گھٹن کا شکار ہوکر ہلاک ہوجائیں گے۔ کیونکہ ہمارے جسم کو تازہ آکسیجن نہیں ملے گی اور زہریلی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس جسم میں پھیل جائے گی۔

نفوذ پذیری (ڈفیوژن) کا یہ قانون ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قدرت کے کارخانے میں وسائل و مادّے کی تقسیم کا تمام تر نظام اسی قانون کے تحت چلتا ہے۔تمام قدرتی وسائل چاہے وہ پانی ہو یا ہوا، غذائی مادّے ہوں یا فضلہ، توانائی ہو یا قوت — سب کے سب اسی اصول کے تحت چلتے نظر آتے ہیں۔اس نکتے کی وضاحت کے لیے ایک اور مثال دیکھتے ہیں۔ زمین کے لیے پانی بے حد اہم ہے۔سوکھی زمین اسی پانی سے زندگی پاتی ہے۔ ہری بھری ہوکر لہلہا اُٹھتی ہے۔سوکھی زمین سے مٹی ہوا کے زور سے کٹ کر بکھرتی رہتی ہے۔پانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہریالی مٹی کو باندھتی ہے۔اسے استحکام دیتی ہے، زرخیز بناتی ہے۔مٹی اور پانی کے اس رشتے کا مشاہدہ ہم اکثر کرتے ہیں۔قرآن مجید میں بھی اس بات کو کئی جگہ واضح کیا گیا ہے۔ پانی مٹی کے لیے بھی حیات بخش ہے۔قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس پیاسی مٹی کو بھی جب پانی ملتا ہے(چاہے بارش سے ملے یا کسی انسان کے ذریعے یعنی آبیاری سے) تو یہ پانی تمام مٹی یعنی زمین میں پھیل جاتا ہے اور اس وقت تک پھیلتا رہتا ہے جب تک کہ مٹی کا ایک ایک ذرّہ پانی سے سیراب نہ ہوجائے۔اگر اس عمل کا آپ چشم دید مظاہرہ دیکھنا چاہیں تو شیشے کے ایک گلاس میں سوکھی مٹی بھرلیں اور اس میں ایک کنارے سے بوند بوند پانی ڈالتے رہیں۔یہ پانی جس طرح پھیل کر مٹی کو گیلا کرتا ہے آپ کو شیشے کے گلاس میں صاف نظر آئے گا۔

قصہ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کے لیے جو وسائل مہیا کیے ہیں وہ اس کے مقرر کردہ قانون کے تحت ہر نظام میں حرکت کرتے ہیں، تقسیم ہوتے ہیں۔ تاہم کیا انسان وسائل کی تقسیم اسی انداز میں کرتا ہے؟ تصور کریں کہ جس گلاس میں آپ نے سوکھی مٹی بھری ہے وہ ایک انسانی سماج ہے۔مٹی کے جس حصے پر آپ پانی ڈالتے ہیں یعنی جسے پانی ملتا ہے، وہ اس سماج کا وہ حصہ ہے جسے اللہ اپنا فضل عطا کرتا ہے۔ انسانی سماج میں یہ طبقہ اللہ کے اس فضل پر قابض ہوکر اسے اپنے ذاتی تصرف میں لاتا ہے جبکہ وہ ''حقیر'' مٹی جسے ہم بے قیمت سمجھتے ہیں، بندگی میں ہم سے کہیں آگے ہے۔ وہ اللہ کے اس فضل کو نہ تو روکتی ہے، نہ اسے اپنی ملکیت سمجھتی ہے بلکہ اسی لمحے اسے ''مستحق سماج''، یعنی سوکھی مٹی کی طرف منتقل کردیتی ہے۔اور اسوقت تک کرتی رہتی ہے جب تک کہ اللہ کا یہ فضل ہر ذرّے تک نہیں پہنچ جاتا اور اس ''سماج'' سے خشکی (یعنی وسائل کی قلت) ایک دَم ختم نہیں ہوجاتی۔ اللہ کی کائنات میں جاری یہ قانون چیخ چیخ کر اعلان کررہا ہے کہ وسائل کی صحیح اور حق تقسیم یہی ہے۔ مالکانہ تصورات، طاغوتی نظام کی پیداوار ہیں۔ اللہ کے پیدا کردہ وسائل سب کے لیے ہیں۔''هُوَ الَّذِی خَلَقَ لَكُم مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً'' (وہی ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں پیدا کیا ہے تم سب کے لیے پیدا کیا ہے)(البقرہ:29)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب وسائل کی تقسیم کا یہ نظام تمام عَالَم میں کارفرما ہے، حق ہے تو پھر اس نظام سے ہٹ کر اگر کوئی ''غیر فطری'' نظام رائج کیا جائے گا تو بھلا وہ کیونکر کامیاب ہوگا۔آج دنیا میں پھیلے فساد کی بڑی وجہ یہی وہ غیر فطری نظام ہے جسے انسان نے رائج کیا ہے۔کہاں ہیں وہ صالحین جو اپنے یہاں، اپنے سماج میں، اپنے علاقے میں، محدود پیمانے پر ہی سہی اللہ کے اس نظام کو جاری کرنے کی ہمت کریں۔

تیسرا سبق: صبر

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں ہر چیز کو کسی مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔اسی مقصد کے مطابق رب العزت نے اس شئے کو ڈھالا ہے اور ہدایت دی ہے جو کہ اس کی فطرت میں موجود ہوتی ہے۔

ہر تخلیق اپنی فطرت کے مطابق پروردگار کے قائم کردہ قوانین کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے اور اپنے رب کا کام بجالاتی ہے۔مثلاً اگر مادّے کی فطرت ہے کہ وہ گرم ہو کر پھیلتا ہے تو وہ پھیلے گا اگر آپ اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کریں تو وہ پوری ثابت قدمی اور استقلال سے اس رکاوٹ کا مقابلہ کرے گا اور اگر اس میں اتنی قوت ہوگی تو آپ کی رکاوٹ کو ختم کردے گا (کیونکہ یہ اسے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرنے سے روکتی تھی) اور رب کا حکم بجالائے گا۔اگر آپ گیس کو کسی ڈبے میں بند کر کے اسے سیل کردیں اور پھر اس ڈبے کو گرم کریں تو اندر موجود گیس پھیلے گی کیونکہ یہ اس کی سرشت میں داخل ہے۔اب اگر پھیلنے کی جگہ نہیں ہے تو وہ ڈبہ توڑ کر باہر نکلے گی یعنی ڈبہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

اسی طرح گیس کی خاصیت ہے کہ وہ گرم ہونے پر ہلکی ہوتی ہے۔کیونکہ گرم ہونے پر اس کے مالیکیول (سالمے) ایک دوسرے سے مزید دور ہوجاتے ہیں، اس کی کثافت کم ہوجاتی ہے لہٰذا وہ ہلکی ہو کر اوپر اٹھتی ہے۔زمین پر ہواؤں کی گردش کا نظام

بڑی حد تک گیسوں کی اسی خاصیت کا رہین منت ہے۔جب ہوا گرم ہو کر اوپر اٹھتی ہے تو اس کی جگہ لینے دوسرے علاقے سے ہوا دوڑ کر آتی ہے۔عموماً زمین پر دن کے وقت ہوا گرم ہوتی ہے اور اوپر اٹھتی ہے سمندری سطح کی نسبتاً ٹھنڈی اور بھاری (کثیف) ہوا اس کی جگہ لیتی ہے۔اس ''جگہ لینے'' کے عمل کے پیچھے بھی قدرت کا ایک قانون ہے۔وہ یہ کہ ہر چیز اپنی زیادہ مقدار والی جگہ سے کم مقدار والی جگہ کی طرف سفر کرتی ہے۔لہٰذا فضاء کے کسی حصے میں اگر ہوا کم ہوجاتی ہے (کیونکہ وہ گرم ہو کر اوپر اٹھ گئی) تو اس مخصوص جگہ ہوا کی مقدار کم ہوگئی۔اب دوسرے علاقے میں جہاں ہوا نسبتاً زیادہ ہے، وہاں سے ہوا فوراً کم مقدار والی جگہ کی طرف کوچ کرتی ہے۔یہ کمی جتنی شدید ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ رفتار سے اردگرد کی ہوا اس کمی والے علاقے کی طرف دوڑتی ہے تاکہ اس ''ناہمواری'' کو ختم کر کے توازن قائم کردیا جائے۔کیونکہ اللہ کی کائنات میں ہر جگہ ہمہ وقت توازن پایا جاتا ہے۔ہوا کی اسی حرکت کو ہم آندھی کہتے ہیں جو محض تیز ہوا سے لے کر شدید طوفانی بھی ہوسکتی ہے۔ایسے میں اگر آپ آندھی کو یعنی ہوا کی حرکت کو روکنا چاہیں تو نہیں روک سکتے کیونکہ وہ پوری قوت سے اللہ کے احکامات کی تابعداری کرنے میں لگی ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہوا کی ہدایت اور راہبری کے لیے جو قوانین بنائے ہیں وہ اس طرح اس کی فطرت سے تال میل رکھتے ہیں کہ ان پر عمل کر کے ہوا عین وہ کام کرتی ہے جس مقصد کے واسطے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔

برسات میں ہر گڈھے پوکھر اور تالاب میں مچھلیاں اور آبی پودے پیدا ہوجاتے ہیں۔لیکن جیسے ہی برسات ختم ہوتی ہے یہ پوکھر سوکھ جاتے ہیں اور ان کی مچھلیاں اور پودے بھی غائب ہوجاتے ہیں۔لیکن عموماً اگلی برسات میں اس پوکھر میں پھر سے مچھلیاں اور پودے نظر آتے ہیں۔یہ کہاں سے آئے؟ مچھلیوں کے انڈے اور آبی پودوں کے ننھے زردانے (Sprores) پانی سوکھنے کے ساتھ ساتھ تالاب کی تہہ میں بیٹھ

جاتے ہیں اور تالاب کی تہہ کی مٹی میں پڑے خشک سخت دنوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ان کا کام نسل کو آگے بڑھانا ہے ۔لہٰذا وہ اپنی بساط کے مطابق ان سخت حالات کا پامردی سے مقابلہ کرتے ہیں حتیٰ کہ پھر سے برسات کے دن آجاتے ہیں۔بارشیں ہوتی ہیں، تالاب بھر جاتے ہیں اور پانی ملتے ہی ان انڈوں سے مچھلیاں بنتی ہیں اور زردانے نشوونما پاکر آبی پودوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔یعنی ان ننھی ننھی جانوں نے بھی سخت اور ناموافق حالات کا ہمت سے مقابلہ کیا۔

پانی کی مثال لیجئے اس کی فطرت ہے کہ ہمیشہ زیادہ مقدار والی جگہ کی طرف سے کم مقدار والی جگہ کی طرف چلتا ہے۔نیز رقیق حالت میں زمین کی قوت کشش کا دوست ہے اسی کی طرف اپنا رخ رکھتا ہے۔پہاڑوں پر جمی ہوئی برف جب پگھلتی ہے تو اس طرح وجود میں آنے والا پانی پہاڑوں کی ڈھلانوں سے سفر طے کرتا ہوا نیچے آتا ہے۔ ایسے میں وہ راہ کی ہر رکاوٹ کا مقابلہ کرتا ہے۔ پہاڑوں کی ذرا ذرا سی دراڑوں سے رستا ہے،اونچائی سے گرتا ہے، چٹانوں سے ٹپکتا ہے اور اپنا سفر جاری رکھتا ہے ۔پانی کی راستہ بنانے کی یہ خاصیت تو ضرب المثال بھی ہے جسے ایک شاعر (شمیم کرہانی مرحوم) نے بخوبی اپنے ایک شعر میں استعمال کیا ہے:

پتھر کے جگر والوں غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے

ایک ننھے بیج کی مثال لیجئے ۔ناموافق حالات میں اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے تمام تر کاروبار لگ بھگ بند کردیتا ہے۔اپنی خوراک کو بے حد کفایت سے خرچ کرتا ہے۔ سانس بھی اتنی سست اور مدھم ہوجاتی ہے کہ بس معمولی سی ہوا میں بھی کام چلا لیتا ہے۔موافق حالات آنے پر اس کی ننھی کونپل زمین کا سینہ چیرتی ہوئی باہر آتی ہے اور نازک جڑیں زمین میں مٹی کے ذرّات کے درمیان راستہ ٹٹولتی ہوئی نیچے کے رخ سفر

شروع کردیتی ہیں تاکہ پانی اور نمکیات کے حصول کا مستقل انتظام ہوسکے۔اسی طرح یہ پودا سخت سست حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے تناور درخت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

الغرض ناموافق سخت اور آزمائشی حالات میں اللہ کی ہر تخلیق جس مصروفیت، پامردی اور استقلال کا ثبوت دیتی ہے یہ ہمارے لیے روشن مثال ہے۔تاہم یہ مثالیں شاید اتنی چونکا دینی والی نہ ہوں جتنی چونکا دینے والی یہ بات ہو کہ میں کہوں کہ اسی استقامت،ثابت قدمی کو عربی زبان میں ’’صبر‘‘ کہتے ہیں۔عربی لغت تاج العروس کے مطابق ’’صَبَر‘‘ کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شئے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا۔لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر ادھر نہ ہو’’الصَّبِیُرُ‘‘ کہلاتا ہے۔اور پہاڑ کو بھی ’’الصَّبِیُرُ‘‘ کہتے ہیں (تاج العروس)۔الصَّا بُورَة اس مٹی وغیرہ کو کہتے ہیں جو اس لیے کشتی میں رکھ دی جاتی ہے کہ اس سے کشتی ہچکولے نہ کھائے۔ جس سے اس کا توازن قائم رہے (محیط)۔ان الفاظ سے صبر کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے اور عین انہی معنوں میں قرآن مجید میں صبر کا استعمال کیا گیا ہے۔سورہ بقرہ میں ہے:

’’رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْراً وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا‘‘(250)

اے ہمارے رب ! ہم پر صبر کا فیضان کر، ہمارے قدم جمادے

یہاں ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (ہمارے قدم جمادے) نے صبر کے معنوں کی بخوبی وضاحت کردی ہے۔

سورۃ آل عمران میں صَابرین کی تعریف ان الفاظ میں کئی گئی ہے:

''فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ. (146)

الله کی راہ میں (اس کے قوانین پر عمل کرنے کی راہ میں) جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، اور نہ دب گئے (مغلوب ہو گئے) اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

دیکھئے صبر کا مفہوم کتنی عمدگی سے بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ اس (رسولؐ) نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا: ''لَوْلَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا'' (42) ترجمہ: ''اگر ہم اس پر (ان کی عقیدت پر) جم نہ گئے ہوتے''۔ یہاں بھی صبر سے مراد ثابت قدمی، جمے رہنا اور ڈٹے رہنا ہی ہے۔ یہی معنی سورۃ ص کی چھٹی آیت میں آئے ہیں ''وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ'' (6) (ترجمہ: ڈٹے رہو اپنے معبودوں (کی عبادت) پر۔

سورۃ انفال میں ہے (ترجمہ) ''اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔ کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے'' (65)۔ یہاں دو غور طلب نکات ہیں۔ اوّل تو صبر کا مفہوم ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے آیا ہے کیونکہ اگر ہم اس آیت میں صبر کا مفہوم وہ استعمال کریں جو آج ہمارے یہاں رائج ہے یعنی بے چارگی میں سپر ڈال دینا، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا تو ایسے لوگ دو سو پر تو کیا دو پر بھی غالب نہیں آسکتے۔ دوسرے یہ کہ مومنوں کو اللہ صابر یعنی جم کر مقابلہ کرنے والے بتا کر کافروں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ ''سمجھ نہیں رکھتے''۔ گویا حالات کی سمجھ رکھنے والا قوانین قدرت کی فہم رکھنے والا ہی صبر کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے۔ یعنی سمجھ اور صبر مومن کے دو بازو ہیں۔

یہ ہے وہ صبر جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرۃ:153)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو (اپنے نشوونما اور اعتدال و تناسب کے لیے) صبر اور صلواۃ سے مدد لو۔

اور پھر فرمایا ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ''۔ (بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یعنی اللہ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے رب کے احکامات کی تعمیل میں، اس کی بندگی میں استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور حق کی راہ میں آنے والی ہر مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں، نہ تو مغلوب ہوتے ہیں، نہ ہی اطاعت بدلتے ہیں اور نہ ہی ہمت ہارتے ہیں۔ کائنات میں اللہ کی ہر وہ تخلیق جس کے بارے میں ہمیں علم ہو چکا ہے اسی انداز سے کام کرتی ہے۔ اللہ کے قائم کردہ قوانین کے مطابق اپنی طبعی عمر پوری کرتی ہے اور ان احکامات کی تعمیل کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ ایسی تخلیقات کی بدولت ہی یہ کائنات متوازن اور نافع ہے۔ یہ ہے صبر کا قرآنی مفہوم جو کہ یقیناً ہمارے مروجہ مفہوم سے یکسر مختلف ہے۔ ہمارے یہاں صبر کے معنی ہیں کہ انسان بے بس و بے کس اور مجبور بن کر بیٹھا رہے۔ یعنی صبر انتہائی بے چارگی کا نام ہے۔ یقیناً اللہ اس قسم کے ''صابروں'' کے ساتھ تو ہو نہیں سکتا۔

چوتھا سبق: ایک مسلم سماج

ہماری زمین ہری بھری زمین ہے۔ اسی لیے اس کو سبز سیارہ بھی کہا جاتا ہے۔ اگر چہ پھیلتے ہوئے شہروں ، کارخانوں اور سڑکوں نے بہت کچھ ہریالی ہڑپ کر لی ہے۔ تاہم اب بھی اللہ تعالیٰ کی یہ ہری مخلوق اس کی رحمت کی طرح ہر جگہ چھائی ہوئی ہے۔ بہ ظاہر یہ سرسبز پودے محض قلب ونظر کو سکون بخش نظر آتے ہیں مگر جن علماء نے ان آیات اللہ کا بغور مطالعہ کیا ہے ان پر ان کے فوائد اور اہمیت واضح ہو چکی ہے۔ علم نباتات یعنی باٹنی (Botany) کا ابتدائی طالبِ علم بھی ان پیڑ پودوں کی افادیت سے واقف ہے۔ یہ ہر جانور کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن گیس فراہم کرتے ہیں، نقصاندہ اور کثیف کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کو جذب کر کے زمین پر آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کا توازن برقرار رکھتے ہیں۔ نیز ہم کو اور دیگر جانداروں کو انواع واقسام کی غذا فراہم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں لکڑی، دوائیں، سوت، کپاس، جوٹ اور اسی طرح کی بیشمار اشیاء ہم کو انہیں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ذرا غور کریں کہ اتنا سامان اگر ہم اپنی تکنالوجی کی مدد سے بنانے کی کوشش کریں تو کس حد تک یہ ممکن ہوگا اور اس کی تیاری کے واسطے کتنے عظیم الشان کارخانے اور فیکٹریاں درکار ہوں گی۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے تیار کردہ یہ کارخانے نہایت عمدہ مشینیں ہیں جن میں زبردست نظم وضبط اور عمدہ ترین کارکردگی کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ یہ محض راقم کا مفروضہ یا خیال نہیں

ہے۔ دنیا بھر کے سائنسداں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ قدرت کے کارخانے کی کارکردگی زبردست ہے اور جو کچھ ہم اپنے طور سے اور اپنی سیکھی ہوئی تکنیک سے بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس کی ہدایت بھی ہم کو قدرتی کارخانے کو سمجھ کر ہی حاصل ہوتی ہے۔

اب آیئے دیکھیں کہ اس عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے یہ پیڑ پودے کس طرح کام کرتے ہیں۔ ہر پودا یا درخت مختلف حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی درخت پر نظر ڈالیں تو اس کی گہری جڑیں اس کو زمین میں گاڑ کر رکھتی ہیں، تنے پر شاخیں موجود ہوتی ہیں اور شاخوں پر ہزاروں ہری پتیاں اور مناسب وقت پر پھول اور پھل۔ یہ درخت ایک ننھے سے سماج کی مانند کام کرتا ہے جس میں ہر فرد کی ذمہ داری طے ہے جسے وہ بحسن وخوبی انجام دیتا ہے۔ مثلاً جڑ کا کام ہے کہ زمین سے پانی اور نمکیات جذب کر کے تنے کے ذریعے اوپر شاخوں، پتیوں اور پھل پھول کو پہنچانا۔ اسی طرح پتیاں اپنے ہرے رنگ کی مدد سے سورج کی روشنی میں غذا یعنی گلوکوز تیار کرتی ہیں اور اس شکر کو ہر اس حصے تک پہنچاتی ہیں جہاں شکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

پودے کی سبز پتیوں میں غذا سازی اور غذائی تقسیم کا عمل قابل غور ہے۔ ہر سبز پتی دن بھر، جب بھی اس کو روشنی میسر آتی ہے، شکر بناتی ہے۔ یہی شکر پودے کے ہر حصے کی غذا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے تمام کام یعنی ضروریات زندگی انجام دیتا ہے، نشو ونما پاتا ہے، تقسیم ہوتا ہے اور اسی کو محفوظ کر کے اپنی بقا کا انتظام کرتا ہے۔ باوجود اس تمام اہمیت کے، کوئی بھی پتی اپنی تیار کردہ شکر کو اپنے پاس بچا کر نہیں رکھتی۔ پس انداز نہیں کرتی بلکہ محض اپنی ضرورت لائق شکر کو استعمال کر کے بقیہ ماندہ تمام شکر اولاً تو ان علاقوں کی طرف روانہ کر دیتی ہے جہاں سبز رنگ نہ ہونے کی وجہ سے شکر سازی نہیں

ہوتی جیسے شاخیں، تنا اور جڑ، یا اگر اس شاخ پر کوئی پھل یا بیج وجود میں آچکا ہے تو اس پھل میں اس شکر کو جمع کردیتی ہے۔ گویا درخت کے اس سماج میں سبز پتیاں وہ ''صاحب خیر'' ہیں جنھیں اللہ نے اپنے ''فضل'' سے نوازا ہے۔ تاہم یہ فضل یافتہ افراد اللہ کے اس فضل کو حاصل کرنے کے بعد اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتے بلکہ اپنی معقول ضرورت پوری کرکے بقیہ فضل (یعنی شکر) اپنے سماج کے ان حصوں کی طرف روانہ کردیتے ہیں جن کو یہ فضل حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ دیگر ضروری کام انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں اور یہ تمام کام بھی سماج کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً جڑ کا زمین میں رہنا ضروری ہے تاکہ زمین سے پانی اور نمکیات جذب کرکے تمام پودے کو سپلائی کرے۔ لیکن زمین میں رہنے کی وجہ سے اسے نہ تو روشنی مل پاتی ہے اور نہ وہ شکر سازی کرسکتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سبز مادّہ عطا نہیں کیا کیونکہ وہ وہاں کے اندھیروں میں محض ضائع ہوتا۔ لہٰذا ان جڑوں کو شکر پہنچانا سماج کے ان طبقات کی ذمہ داری ہوئی جو کہ شکر بناتے ہیں۔ لہٰذا پتیاں یہ کام کرتی ہیں اور کسی لمحہ یہ نہیں سوچتیں کہ یہ شکر تو ہم نے بنائی ہے۔ یہ ہماری محنت کا پھل ہے، ہماری مشقت کی روزی ہے، اسی سے ہمیں صحت و بقا حاصل ہوتی ہے تو پھر ہم اس کو کیوں نہ جمع کریں اور جڑوں کو نہ بھیجیں۔ وہ ایسا نہیں سوچتیں کیونکہ کائنات کی دیگر سبھی اشیاء کی طرح یہ بھی ''مسلم'' ہیں یعنی اللہ کے احکامات کی پابند۔ وہ احکامات جو اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو پیدا کرکے اس پر لازم کردیئے ہیں (سوائے انسان کے کہ اسے حق و باطل کو چننے کا اختیار دیا گیا ہے)۔

جب پودے میں شکر سازی شباب پر پہنچ جاتی ہے اور شکر پودے کی ضرورت سے زیادہ بننے لگتی ہے تو اس وقت پودے پر پھول آتے ہیں تاکہ وہ بارآور ہو، پھل اور بیج بنا کر اپنی نسل کو آگے بڑھانے کا انتظام کرے۔ اب جن شاخوں پر پھل آتے ہیں ان کے نزدیک والی پتیاں اپنی فاضل شکر کو اس ''بیت المال'' یعنی پھل میں جمع کرتی رہتی

ہیں۔ پھل تیار ہوجاتا ہے۔ یہ پھل کسی بھی ضرورت مند کی بھوک بھی دور کرتا ہے۔ اس کے جسم کو شکر کی شکل میں توانائی بھی فراہم کرتا ہے اور اپنے قلب میں سمیٹے ہوئے بیجوں کی مدد سے اپنی نسل کو آگے بڑھانے میں بھی مدد کرتا ہے۔ پتیاں اپنی محنت سے تیار کردہ شکر جب پھل میں منتقل کرتی ہیں تو یہ سوال نہیں کرتیں کہ اس پھل سے فیض کسے حاصل ہوگا۔ اس پر اجارہ داری کس کی ہوگی۔ یہ کس کی ملکیت ہوگا۔ برخلاف ان تمام فتنہ پرور رجحانات کے، وہ پوری تندہی سے اللہ کے ''مسلم'' اور ''بندے'' کی طرح اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ بیشک اس انداز سے اللہ کی بندگی کرنے والوں کے لیے اللہ ہی کافی ہے (اَلیس اللّٰہ بکافٍ عَبدَہٗ......) اسی وجہ سے اس ہرے سماج کو یا کائنات میں پھیلی اللہ کی کسی بھی تخلیق کو کسی غیر اللہ کی مدد و تائید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی کارکردگی کسی فرد، سماج یا ملک کی محتاج نہیں ہوتی۔

اس سماج میں ہر فرد اپنی ذمہ داری بخوبی سمجھتا ہے اور آخری سانس تک اسے نبھاتا ہے۔ پتی بھی جب تک پوری تندہی سے شکر سازی کرسکتی ہے اس سماج کا حصہ بنی رہتی ہے۔ جیسے ہی اس کے قویٰ کمزور ہونے لگتے ہیں، کارکردگی کم ہونے لگتی ہے، وہ اپنا سبز رنگ اور دیگر قابلِ انتقال اثاثہ پودے کو واپس کردیتی ہے، ہم کو زرد ہوتی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے جسم کا پانی بھی پودے کو واپس دیتی ہے اور سوکھ کر، زرد ہوکر، پیڑ سے ٹوٹ کر مٹی میں آگرتی ہے تاکہ اس کی جگہ پر تازہ دم پتی آکر سماج کی خدمت کرے۔ گویا جب تک وہ اس سماج کا ''نافع'' حصہ رہی اس سے وابستہ رہی۔ مضمحل ہوتے ہی اس سے الگ ہوگئی۔ تاکہ ایک نئی پتی جگہ پاسکے۔ یہ ہے اللہ کا قائم کردہ ایک سماج۔ جس میں نہ تو وسائل پر ان کا قبضہ ہے جن کو یہ وسائل دیئے جاتے ہیں، عدل و انصاف کے ساتھ یعنی حسبِ ضرورت وسائل کی تقسیم ہے، عدم توازن کسی سطح پر نظر نہیں آتا، ہر فرد ''نافع'' فرد ہے۔ بلاوجہ، ناکارہ حالت میں کسی شئے کا وجود

نہیں ہے۔ سماج کے افراد امن وسکون کے ساتھ اپنی اپنی جگہ موجود ہیں ۔ نہ تو ملک وملکیت کا جھگڑا ہے نہ افضلیت اور انانیت کا فساد ہے۔حکم اللہ کا ہے، وسائل اس کے ہیں اور مستحقین تک پہنچائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ''مسلم'' سماج ہے۔ اللہ کی یہ آیت ہم کو سکھاتی ہے کہ مسلم سماج کیسا ہونا چاہئے۔ اللہ کی آیات پر ایمان لانے والوں پر لازم ہے کہ وہ اسی انداز سے اللہ کے احکامات کو بجالائیں ورنہ محض ''زبانی'' دعویداریوں سے حقِ بندگی ادا نہیں ہوگا۔

پانچواں سبق: اپنی حیثیت

رات کے وقت تاروں بھرا آسمان کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ ٹمٹماتے ستارے ہم سے کتنی دوری پر ہیں؟ اس کائنات کی وسعت کیا ہے؟ سورج ہماری زمین سے نزدیک ترین ستارہ* ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہمیں اتنا روشن نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی کرنیں اپنی بیشتر روشنی اور حدت کے ساتھ ہماری زمین پر ہر صبح اُتر آتی ہیں۔ سورج زمین سے تقریباً 15 کروڑ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ روشنی جو کہ تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے، سورج سے زمین تک آنے میں آٹھ منٹ لیتی ہے۔ تاہم ستاروں کے درمیان فاصلوں کو ناپنے کے لیے کلومیٹر بہت ہی چھوٹا پیمانہ ہے لہٰذا خلا پیمائی کے لیے سائنسدانوں نے نوری سال (Light Year) کا پیمانہ تشکیل دیا۔ روشنی (جو کہ ایک سیکنڈ میں 3 لاکھ کلومیٹر سفر کرتی ہے) اگر مسلسل ایک سال تک چلتی رہے تو جتنا فاصلہ یہ اس ایک سال میں طے کرے گی اس کو ایک نوری سال یا لائٹ ایئر کہتے ہیں۔ سورج کے بعد ہماری زمین سے نزدیک ترین ستارہ ''پروکسما سنٹوری'' (Proxima Centauri) ہے۔ جو کہ ساڑھے چار نوری

* کائنات میں پائے جانے والے وہ تمام اجسام جن کے قلب میں نیوکلیائی بھٹی روشن ہو اور جو روشنی اور حدت خارج کرتے ہوں ستارے کہلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ اجسام جو بذاتِ خود روشنی یا حدت خارج نہیں کرتے بلکہ دیگر ستاروں کی روشنی میں چمکتے ہیں یا نظر آتے ہیں، سیارے کہلاتے ہیں۔

سالوں کی مسافت پر ہے۔ یعنی اس ستارے کی روشنی مسلسل ساڑھے چار سال چلنے کے بعد زمین پر آتی ہے (موازنہ کریں کہ سورج کی روشنی محض 8 منٹ میں 15 کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے زمین پر آجاتی ہے)۔

اب آیئے اپنے نظام شمسی پر نظر ڈالیں۔ ہمارا نظام شمسی ستاروں کے جس جھنڈ یا گروپ کا حصہ ہے اسے ''ملکی وے'' (Milky Way) یا ''دودھیا کہکشاں'' کہتے ہیں۔ ستاروں اور ان کے سیاروں کے ایسے گروپ یا جھنڈ کو گیلکسی (Galaxy) یا کہکشاں کہا جاتا ہے۔ ہماری کہکشاں کی شکل ایک ایسی طشتری کی سی ہے جس کا درمیانی حصہ موٹا اور کنارے پتلے ہیں۔

اس کہکشاں کا قطر ایک لاکھ نوری سال ہے۔ یعنی اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں روشنی کو ایک لاکھ سال لگتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ ذرا اس کہکشاں کی وسعت کا اندازہ لگائیں۔ اس کے مرکز سے بائیں طرف 30,000 نوری سالوں کے فاصلے پر ہمارا نظام شمسی محض ایک نقطے کی مانند نظر آتا ہے (تصویر میں اس مقام کو تیر کی مدد سے دکھایا گیا ہے) یہ ہے وسعت محض ایک کہکشاں کی۔ ہماری کائنات میں ایسی کروڑوں گیلکسیاں ہیں— کیا اس کائنات کی وسعت کا تصور بھی

کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ تو خالق کریم کی محض ایک آیت ایک تخلیق ہے۔ ان کہکشاؤں میں کیسے کیسے ستارے اور سیارے موجود ہیں، ان کے اجسام میں کیا کچھ ہو رہا ہے، ہمیں کچھ نہیں پتہ۔ اس وسیع وعریض کائنات میں، کروڑوں کہکشاؤں میں، ہماری کہکشاں کی کیا حیثیت ہوگی اور پھر اس کہکشاں میں ہمارا پورا نظام شمسی ایک معمولی نقطے کی طرح— اور اس نظام شمسی کا ایک حصہ زمین اور اس پر ہمارا وجود— کیا ان وسعتوں کا اندازہ کرنے کے بعد، اس علم سے واقف ہونے کے بعد، اللہ کی ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی انسان کے دل میں بڑائی اور تکبّر آسکتا ہے۔ اس کائنات کی وسعت اگر ایک طرف اپنے خالق کی عظمت کا اعلان کرتی ہے تو دوسری طرف انسان کی کم مائیگی کا انکشاف کرتی ہے۔ کیا ایسے جلیل القدر رب کے احکامات سے بغاوت کر کے انسان کسی صورت بچ سکتا ہے۔ یقیناً نہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ جو اس کائنات کی عظمتوں سے واقف ہیں ان کی اکثریت حقیقی رب سے واقف نہیں، اس کائنات کے خالق اور اس کے احکامات سے واقف نہیں اور جو رب اور اس کے احکامات سے واقف ہیں (یا ایسا سمجھتے ہیں) وہ اس کائنات کی وسعتوں کی طرح اللہ کی دیگر آیات سے غافل اور بے بہرہ ہیں لہٰذا ان کی اکثریت بھی رب کی عظمت سے غافل ہے۔ نتیجتاً وہ بندگی کے اس درجے پر نہیں جو کہ مطلوب ہے۔

چھٹا سبق: کامل تسبیح

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو اپنی آیت (نشانی) کہا ہے:

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش/مخلوق میں اور رات دن کے ہیر پھر میں عقل مندوں کے لیے آیات (نشانیاں) ہیں۔'' (اٰلِ عمران:190)

پروردگار کی یہ تمام تخلیقات عین اُس کے حکم کے مطابق کام کرتی ہیں گویا اس کی مکمل بندگی میں ہیں یعنی ''اس کی'' مسلم ہیں، اس کی اطاعت گزار ہیں:

''زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ، سب اللہ کے لیے سجدہ ریز ہیں (مکمل مطیع ہیں) اور تکبّر (سرکشی) نہیں کرتے۔ اپنے رب سے، جو اُن کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔'' (النحل 49 -50)

ربِّ کریم نے ہر چیز کو پیدا کر کے ہدایت سے نوازا ہے، اسے ایک لائحہ عمل دیا ہے، ایک نصب العین دیا ہے جس کی جانب وہ پوری قوت و توانائی سے رواں دواں رہتی ہے۔ سرگردانی کے اس پہلو کو کلام پاک میں س۔ ب۔ ح کے مادّے سے مختلف جگہ بیان کیا گیا ہے:

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پَر پھیلائے اڑ رہے ہیں؛'' (النور: 41)

لغات کے مطابق سَبُحٌ کے معنی ہیں تیرنا۔ ''فِی اِلنَّھرِ سَبُحاً'' نہر میں تیرا۔ اَلسَّابِحَاتُ کشتیوں کو کہتے ہیں۔ اَلسبّٰاحُ۔ اچھے پیراک کو کہتے ہیں۔ نیز اس سے مشابہت کی بناء پر تیز رفتار گھوڑے اور اونٹ کو بھی کہتے ہیں۔ تلاشِ معاش کے لیے تگ و دو کرنے اور دوڑنے یا چلنے میں دور تک نکل جانے کو بھی سَبُحٌ کہتے ہیں (تاج العروس)۔ چنانچہ مقاییس اللغۃ میں ابنِ فارس نے اس کے بنیادی معنیٰ دوڑ کی ایک قسم بھی لکھے ہیں۔ لہٰذا سَبُحٌ کے معنی ہوئے کسی کام کی تکمیل کے لیے پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جدو جہد کرنا۔ تاج میں ابنِ شمیل کے خواب کا ذکر ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص ان کے لیے سبحان اللہ کی تفسیر بیان کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح اپنی تیز رفتاری میں تیر رہا ہوتا ہے۔ یعنی سبحان اللہ کے معنی ہیں خدا کی طرف تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا (تاج العروس)

المفردات فی غریب القرآن میں راغب نے بھی کہا ہے کہ سَبُحٌ اصل میں ''پانی یا ہوا میں تیزی سے گزرنا'' ہے۔ التسبیح خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔ بعد ازاں اس کا استعمال وسعت اختیار کر گیا اور اسے قول یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لیے بولا جانے لگا۔ حتیٰ کہ اب سَبُحَۃٌ ان دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پروئے جاتے ہیں۔ (حالانکہ یہ چیز عربوں میں غیر معروف تھی۔ تسبیح عیسائی راہبوں کے یہاں ہوتی تھی جنہوں نے اسے غالباً بدھ مَت والوں سے لیا تھا)۔

قرآن کریم میں اجرامِ سماوی کے متعلق ہے ''کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَسْبَحُوْنَ (یٰسین:40)'' وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں''۔ رسول اللہ کے متعلق ارشاد ہے: ''اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبُحاً طَوِیْلًا (المزمل:7) ''بیشک آپ کے لیے دن میں طویل شغل (سرگردانی) ہے''۔ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَافِی

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الحدید:1) کے معنی ہیں کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں، جو قانون خداوندی کی رو سے ان کے لیے متعین کیا گیا ہے، پوری شدت اور تیزی سے مصروف عمل ہیں۔ انسان کے سوا کائنات کی ہر چیز اللہ کے احکامات کی تکمیل میں ازخود (Instinctively) سرگرم عمل رہتی ہے۔ اسی کو قصۂ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے:

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ" ۔"آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں"۔(البقرہ:30)

اسی طرح سورہ الرعد (آیت:13) میں اس کو رعد کی تسبیح کہا گیا ہے۔

برخلاف اس کے، انسان کو اللہ کی ہدایت فطری یا جبلّی طور پر نہیں دی گئی ہے بلکہ اختیاری ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کی ہدایت (وحی) کی تعمیل کرے یا پھر نفسانی خواہشات (اہوا) کی پیروی کرے۔ جو افراد واقوام اللہ کی ہدایت پر ایمان لاکر صالح عمل کرتے ہیں وہی مؤمنین اور اللہ کے مسلم کہلاتے ہیں۔اسی لیے مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ "**سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلاً** "۔تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام (ہدایت) کی تکمیل کے لیے مصروف سعی وعمل رہو (الاحزاب:42) اور یہ پروگرام کیا ہے؟

"**فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ** "(الواقعہ:96) یعنی اپنے رب کی صفات کو ،جن پر ساری کائنات کی عمارت استوار ہے ،انسانی معاشرے میں جاری و ساری کرنے کے لیے سرگرم رہنا۔اس راستے میں جو مشکلات آئیں ان کے خلاف جدو جہد کو بھی "ذکر وتسبیح" کہا گیا ہے ۔چنانچہ جب حضرت موسیٰ فرعون کی طرف جانے لگے تو انھوں نے اپنی اس مہم کے لیے ہی کہا تھا "**کَیْ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا o وَنَذْکُرَکَ کَثِیْرًا** o (طٰہٰ:34)۔اس جانب انسان کو راغب کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ قرآن کریم میں مثالیں دی ہیں کہ دیکھو کائنات میں پھیلی اس کی مختلف

تخلیقات (آیات) کس طرح اللہ کی ہدایت کے مطابق نظامِ ربوبیت کو قائم رکھنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

"**تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط**"۔ اس کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو"۔ (نبی اسرائیل:44)۔

قرآن کریم جو نظامِ زندگی جماعتِ مومنین کے لیے تجویز کرتا ہے اس میں صلواۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔یہ اس جماعت کے جذبۂ اطاعتِ خداوندی کے عملی مظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار رکوع وسجود کی شکل میں سامنے آتا ہے ۔جسمانی (ظاہری) رکوع وسجود میں ایک مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اس کے قوانین کی اطاعت (بندگی) اور اس کے بنائے ہوئے فرائض کی سرانجام دہی کے لیے جدو جہد میں صرف کرے گا۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام طور پر انہیں خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کا اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کر کے نہ دکھائے تو یہ زبانی قول وقرار ایک بے نتیجہ رسم سے زیادہ حیثیت نہ رکھیں گے۔ اگر عمل نہ ہو اور انسان ان زبانی اقراروں کو اور جسمانی حرکتوں کو منزل مقصود سمجھ لے تو نتیجہ ظاہر ہے وہ نہیں ہوگا جو منشاءِ الٰہی ہے۔

لسان العرب میں ہے کہ تسبیح کے معنی "تنزیہ" کے ہیں۔ نیز یہ لفظ "**سُبْحَانَ اللّٰه** " کہنے یا صلواۃ اور ذکر اللہ ،حمد وثنا کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لیے تنزیہ کے معنی ہوں گے :خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا۔ چونکہ اس مادّے میں تیزی ،مضبوطی اور شدت کا پہلو

ہوتا ہے اسی لیے کِسَــاءٌ مُسَبَّحٌ کے معنی ہیں بہت مضبوط اور سخت بُنا ہوا کمبل۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحُ بِا سُمِ رَبِّکَ الْعَظِیُمْ کے معنی مزید واضح ہو جاتے ہیں یعنی صفاتِ خداوندی کو نہایت تیزی، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا۔

علیم ،اللہ کا ایک اسم اور علم اس کی صفت ہے۔ہم کو علم حاصل کرنے اور اسے پھیلانے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ یہ اللہ کے ایک اسم کی تسبیح ہوگی۔ وہ منصف اعلیٰ ہے۔ہم کو عدل و انصاف قائم کرنا چاہیے اور اس کے لیے ہر وقت مصروف رہنا چاہیے۔غرض اللہ کی ہر ہر صفت ہمارے لیے ایک دعوتِ عمل ہے جو ہمیں پکار رہی ہے۔کیا ہم اپنی تسبیح کو سمجھتے ہیں؟

نیا عہد نامہ

ہمارے ملک کی بہت سی ریاستوں میں قبائلی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔مثلاً مدھیہ پردیش میں آپ بَستر کے علاقے میں جائیں تو وہاں کے جنگلات میں آپ کو قبائلی ملیں گے۔ان لوگوں کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا ہے کہ یہ آج کے دور کے انسان ہیں۔جو کوئی انھیں دیکھتا ہے بے ساختہ اس کے منہ سے ''جنگلی'' نکلتا ہے۔ تاہم کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ کسی حد تک ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہندوستان کے بیچ میں یہ قبائلی کیونکر آباد ہیں۔ ان قبائلیوں پر تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ افراد بھی دیگر انسانوں کی طرح اوسط ذہانت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔لیکن چونکہ ان کو وہ تعلیم وتربیت اور تجربات و مشاہدات میسر نہیں آتے جو کہ آج ہمارے معاشرے کے دیگر افراد کو حاصل ہیں لہٰذا ان لوگوں کا ذہن نشو ونما سے محروم رہ جاتا ہے۔ دیگر انسانی اعضاء کی طرح ذہن کے نشو ونما کا تعلق بھی اس کے استعمال سے ہے۔ اگر اس کو استعمال کرنے کا موقع ہی نہ آئے تو ذہن نشو ونما کی بہت ہی معمولی سطح پر رک جاتا ہے۔

دوسرا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں تک جدید دور کی ترقی اور اس کی تبدیلیاں کیوں نہیں پہنچیں؟ اس کا جواب بھی ہمیں محققین دیتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو گزشتہ ادوار میں کسی نہ کسی وجہ سے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے، جنگلات یا دیگر پیچیدہ مقامات پر گوشہ نشیں ہوگئے۔اپنے سے مختلف ہر شخص کو انھوں نے اپنا دشمن،اور اس کی ہر

بات کو اپنے لیے نقصاندہ سمجھا۔تبدیلی کی پذیرائی کرنے کے بجائے اس کو اپنے لیے مضر سمجھا۔نہ صرف اپنی بستیاں بلکہ اپنے ذہنی دریچے بھی باہر کی پھیلتی پھولتی دنیا اور اس کی جدتوں کے لیے بند کرلیے۔بھلا ایسے علاقوں اور ذہنوں تک علم کی رسائی کیونکر ہوتی۔نتیجہ سامنے ہے کہ آج عین آبادیوں کے بیچ میں یہ قبائلی ’’محرومین‘‘ کی ایک سبق آموز مثال بن کر رہ گئے ہیں۔

تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں علم وفن کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے وہ پچھلے ہزار برسوں میں نہیں ہوئی تھی۔معلوماتی ترقی کی یہ رفتار آئندہ صدی مزید تیز رو ہوجائے گی۔آئندہ صدی ’’معلوماتی انڈسٹری‘‘ (Knoledge Industry) کی صدی ہوگی کہ جس میں معلوماتی تجارت ہی سب سے نفع بخش تجارت ہوگی۔ہمارے یہاں کہاوت ہے کہ ’’پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں‘‘ لیکن اگلی صدی کی تو پیدائش سے قبل ہی اس کے ’’پاؤں‘‘ نظر آنے لگے ہیں۔آج دنیا کا امیر ترین شخص کوئی فورڈ نہیں بلکہ کمپیوٹر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بل گیٹس ہے۔خود ہمارے ملک میں بھی گزشتہ مالی سال میں امیر ترین شخص ٹاٹا، برلا یا کوئی امبانی نہیں بلکہ نرائن مورتی تھا جو اسی ’’معلوماتی تجارت‘‘ کے میدان کا شہ سوار ہے۔

چند سو سال پہلے جو جماعتیں دنیا کی تبدیلیوں سے کنارہ کش ہو کر گوشہ عافیت میں جا چھپی تھیں وہ آج کے دور میں قبائلی کہلاتی ہیں۔ہم نے علم وفن سے گزشتہ سات سو برس سے جو کنارہ کشی اختیار کی ہے وہ ہمیں آنے والے کل کا قبائلی بنا رہی ہے۔علم کے ٹھاٹے مارتے بحر ذخار سے بہرآور ہونے کے بجائے ہم اپنی خانقاہوں ، مدرسوں ،مکتبوں، مسلکوں ،طریقتوں اور فرقوں کے ’’قلعوں‘‘ میں اس طرح گوشہ نشین ہیں کہ بیشتر کے دروازے جدید علوم کے لیے بند ہیں۔ہم آج علم وفن کے میدان میں ہونے والی ترقیوں سے مستفیض تو ہو رہے ہیں تاہم ان میدانوں کے شہسوار نہیں پیدا کر رہے۔ ہمارا

طرز تعلیم اور انداز فکر آج بھی دسویں اور گیارھویں صدی کے معیار اور علوم سے مطابقت رکھتا ہے۔کیا عجب ہے کہ آج تمام عالم میں ہماری اکثریت غلامی، جبر وتشدد اور ذلت وخواری سے دوچار ہے۔گزشتہ صدی میں کہ جب اصل طاقت سائنس وٹکنالوجی یعنی علم وفن کے ماہرین کے پاس تھی ہم سرمائے کو طاقت کا ذریعہ سمجھتے رہے ہمارے سرمائے دار ’’اسلامی‘‘ ممالک کا کیا انجام ہوا، ہمارے سامنے ہے اور سبق آموز ہے پھر بھی ہم ملی، سماجی اور انفرادی طور پر اپنی تمام توانائی جائز ناجائز طریقوں سے سرمایہ کمانے میں لگا رہے ہیں۔آنے والی صدی معلومات کی صدی ہوگی۔اگر ہم اس میں بھی اسی طرح غفلت اور جہالت کو سینے سے لگائے رہے تو انجام بہت ہولناک ہوگا۔اب بھی وقت ہے کہ ہم اگلی صدی کے لیے اپنا ’’تعلیمی ایجنڈا‘‘ ہر قسم کے مذہبی اور مسلکی تعصب سے اوپر اٹھ کر طے کرلیں۔علم کی مصنوعی تقسیم کو ختم کرکے ہر نافع علم کو گلے سے لگائیں۔کیا ہی اچھا ہو اگر ہم موجودہ صدی کو ’’تکمیل علم‘‘ کی صدی کے طور پر گزارنے کا عہد کرلیں۔ جدید علوم کی درس گاہوں میں بامعنی قرآنی تعلیمات کا اہتمام کریں اور مدارس ومکاتب میں جدید علوم کو باقاعدہ جگہ دیں۔ ان علوم کا فیوژن کرکے مکمل تعلیمی خاکہ اپنی نئی نسلوں کے لیے تیار کریں اور اسی نہج پر نئی درس گاہیں قائم کریں۔ہمیں ہر حال میں اپنی نئی نسلوں کو قرآن کی مکمل، بامعنی اور بامقصد تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم خصوصاً معلوماتی ٹکنالوجی سے متعلق علوم میں مہارت دلانی ہوگی تاکہ ترسیل وابلاغ کے ان نئے ذرائع کا استعمال اسلام کی تبلیغ وترویج کے واسطے بھی کیا جاسکے۔ہم کو بہت ٹھنڈے دل ودماغ سے یہ سوچنا ہوگا کہ ہمیں اگلی صدی کے واسطے کس انداز اور کس تعلیم وتربیت کے مدارس، اساتذہ، خطیب ومبلغ درکار ہوں گے۔

جدید تعلیمی نظام

آج عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ تعلیم ہر قسم کے مسائل کا حل ہے۔ تاہم موجودہ دور کے نظامِ تعلیم نے جو افراد اور جو معاشرہ تیار کیا ہے اس نے مسائل حل کرنے کے بجائے پیدا کیے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ تعلیم کا اس کے اصل مقصد سے ہٹنا ہے۔ آج لگ بھگ صد فی صد لوگ معاش کے حصول کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں لہٰذا تعلیم کا سارا زور اور تعلیمی اداروں کی تمام تر توجہ بھی اس طرف ہے کہ اس انداز کا نظامِ تعلیم تربیت دیا جائے کہ جس کی مدد سے ہر شخص بہتر سے بہتر معاش حاصل کر سکے۔ انسان کی تربیت یا ''انسان سازی'' کا عنصر اس مادّی نظامِ تعلیم سے تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم بھی اسی ڈگر پر چل نکلا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم نے انسان اور انسانیت کے لیے ایک معیار مقرر کرتے ہوئے جامع ہدایات دی ہیں اور علم کی اہمیت بھی واضح کی ہے لیکن ہم لوگوں نے قرآن کریم سے اس میدان میں بھی ہدایت حاصل نہیں کی۔ علم کے ذریعے معاش حاصل کرنے کی ایک ضمنی حیثیت تو ہو سکتی ہے اور ہے بھی تاہم یہ عین مقصدِ حصولِ علم نہیں ہونا چاہیے۔ طلباء میں اس وصف کو پیدا کرنے کے واسطے لازمی ہے کہ ان کو قرآن کریم کی بامقصد اور بامعنی تعلیم دی جائے یعنی وہ قرآن کریم کو سمجھ کر اس پر غور و فکر کرنے کے لائق بن سکیں۔ اسی طرح وہ قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق زندگی گزار سکیں گے۔ اس نظریے کی اہمیت کی وضاحت

ایک مثال سے کی جا سکتی ہے۔ قرآن کریم ہم کو انسانیت کی خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ہر قسم کے استحصال سے منع کرتا ہے، ضرورت مند کی مدد کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اب کسی تعلیمی نظام سے دو بچے فارغ ہو کر نکلتے ہیں۔ مان لیں وہ ڈاکٹر بنتے ہیں۔ ایک بچے کو قرآن کریم اس طرح اور اس حد تک سمجھا کر پڑھایا گیا ہے کہ وہ قرآن کی ہدایات سے مکمل واقفیت رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ دوسرا بچہ اس تعلیم سے محروم ہے۔ دونوں مسلمان ہیں۔ آخر الذکر ایسے کسی بھی ادارے میں نوکری کر لے گا جو اسے اچھی تنخواہ دے۔ اس آمدنی سے وہ ایک اچھے معیار یعنی عمدہ لائف اسٹائل کے ساتھ اپنی زندگی آرام سے گزارے گا۔ اوّل الذکر نوکری قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھے گا کہ آیا کہ وہ ادارہ انسانیت کی خدمت کر رہا ہے یا استحصال۔ وہ ایسے کسی نظام کا حصہ نہیں بنے گا کہ جہاں بہ ظاہر خدمت کے نام پر درحقیقت انسان کا استحصال ہو رہا ہو، ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔ وہ اپنی آمدنی سے حسب ضرورت اپنی ذات اور خاندان پر خرچ کر کے بقیہ دیگر مستحقین کی نذر کرے گا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو آج بہتر لائف اسٹائل کی دوڑ میں روز بروز مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مادّہ پرستی وہ صارفین (Consumers) پیدا کر رہی ہے جو اس نظام کے بانیوں کو مطلوب ہیں تاکہ وہ اس نظام کو نہ صرف قائم رکھیں بلکہ اس میں ہر لمحہ توسیع کرتے جائیں۔ اگر ہمارا تربیت یافتہ بچہ قرآنی فکر سے واقف ہے تو وہ سماج کے کسی بھی شعبے میں جائے کسی بھی طرح کے معاش سے وابستہ ہو، چاہے انجینئر ہو، ڈاکٹر ہو، سائنسداں ہو یا ماہر معاشیات، وہ ہر حال میں انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے کوشاں رہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جو آج ہمارے نظامِ تعلیم سے ختم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ یہ نظام عین مادّہ پرستوں کے تیار کردہ ماڈل پر چل رہا ہے اور محض صارفین پیدا کر رہا ہے۔ اس کا تدارک صرف اور صرف یہ ہے کہ بچوں میں قرآنی فکر پیدا کی جائے جس کے لیے لازم ہے کہ ان کو قرآن کریم کی

تعلیم آج کے پس منظر میں اور ان کے نصاب کے جز کے طور پر دی جائے۔ وہ اس کائنات کا مطالعہ ''آیات اللہ'' کے طور پر کریں تاکہ ایک طرف انھیں اپنے رب کی عظمت اور حکمت کا احساس ہو تو دوسری طرف اس کی رحمت اور فضل کا۔ رب کی شان کو سمجھ کر ہی ان کے اندر بندگی کا وہ جذبہ پیدا ہوسکتا ہے جو ان کو مادّیت کے دلکش جال سے دور رکھنے کی قوت عطا کرے گا۔ اپنے رب کے قائم کردہ نظام کو سمجھنے کے بعد، اس کائنات میں اس کے جاری وساری ہونے کا خود مشاہدہ کرنے کے بعد ان کا یقین اس بات پر کامل ہوجائے گا کہ ان کے رب کا قائم کردہ نظام ہی حق ہے اور اس سے روگردانی کرنا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ جب ہم قرآنی تعلیم نیز فہم وفکر کو علوم کے ساتھ یکجا و یک جان کردیں۔ اس فیوژن کے بعد ہی ہم حصولِ علم کا حق ادا کرسکیں گے۔ ہمارے اداروں میں دین ودنیا کے دھارے ساتھ آکر بھی الگ الگ بہتے ہیں۔ شعبۂ دینیات الگ ہے اور شعبہ جات علوم الگ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ علوم کو قرآن کے ساتھ ہم آہنگ کرکے پڑھا جائے۔ علوم فطرت پڑھاتے وقت جب ہم کائنات میں وسائل کی تقسیم اور ان کے دوران (Cycle) کا ذکر کریں تو طلباء کو یہ بھی بتائیں کہ اس موضوع پر قرآن ہمیں کیا ہدایت کرتا ہے۔ معاشیات اور تجارت پڑھاتے وقت بچوں کو تجارت ومعاش اور وسائل سے متعلق قرآنی احکامات بھی بتائیں اور ان کی اہمیت اور افادیت اُجاگر کریں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے ہم وہ مسلمان پیدا کرسکیں گے کہ جو پورے کے پورے اسلام میں ہوں گے۔ اللہ کے دین کو، اس کے قانون کو مسجد، درگاہ یا مصلّے تک محدود نہیں رکھیں گے بلکہ یہ دین تمام دنیوی معاملات میں بھی ان کا عملاً راہبر اور رہنما ہوگا۔ یہی وہ امتِ محمدی ہوگی جو آج سے ہزار سال قبل ایک حد تک معدوم ہوگئی تھی، جس کی عظمت کے نشان آج بھی ٹمبکٹو کی عظیم الشان یونیورسٹی سے لے کر، بغداد، غرناطہ، قرطبہ اور استنبول کے در ودیوار پر نظر آتے ہیں۔

اس نظام کے قیام کے واسطے سب سے بڑا چیلنج افراد سازی ہے۔ یعنی وہ ماہرین علوم جو اپنے تخصیصی علوم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم سے بخوبی واقف ہوں اور دونوں کو یکجا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ پہلا مرحلہ ہوگا ایسے افراد کی تیاری کے بعد ہی ہم ان تعلیمی اداروں کے قیام کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ جہاں یہ باہم مربوط یعنی Integrated تعلیم کا نظام قائم کیا جاسکے۔ یہی وہ مسلم تعلیمی ادارے ہوں گے جن کی ہمیں اور تمام انسانیت کو ضرورت ہے۔ مسلم طلباء یا مسلم اساتذہ کی اکثریت رکھنے والے اداروں کو ہم مسلم ادارہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایسی خوش فہمی ہے کہ جس کی یہ زوال پذیر قوم مزید متحمل نہیں ہوسکتی۔

وہ صبح کبھی تو آئے گی

انسان کے احساس کا تعلق اس کی سوچ سے ہوتا ہے۔آج فجر کے وقت بھی مجھے تاریکی کا احساس ہورہا ہے۔ یہ کیسی صبح ہے جو تاریکی ساتھ لائی ہے۔گزشتہ شب بہت ہلچل تھی۔ میرے پڑوسی، میرے برادرانِ وطن بہت خوش تھے کہ نیا سال آرہا ہے۔ نئے سال کی آمد کا جشن منا کر سب تھک کر سوچکے ہیں۔ میرے احباب مجھے کئی دنوں سے مبارکباد دے رہے ہیں کہ اللہ کے فضل وکرم سے روشن ہوئے اس چراغ کا بفضلہٖ جہالت کے اندھیروں سے جہاد جاری ہے۔ اس ننھے چراغ نے اپنے جہاد کے دس سال مکمل کرلیے ہیں۔مبارک ہو۔ مجھے بھی تو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ کے حکم سے جاری اس علمی تحریک کی آج ایک نئی صبح طلوع ہورہی ہے۔لیکن کیا کروں یہ صبح بھی میرے جسم وجاں میں کسی سرور انگیز لہر کو بیدار نہیں کرتی۔ایسا لگتا ہے میرے وجود کی تاریکی میں صبح کی لطیف کرنیں گم ہوگئی ہیں۔میرے لیے یہ نئی صبح یہ نیا سال ایک اضافہ ہے۔ میری جہالت کی عمر میں مزید ایک سال کا اضافہ ہوگیا۔میرے ماتھے پر لگا یہ تاریک داغ کچھ اور گہرا ہوگیا ہے۔ میں کلام پاک لے کر بیٹھ جاتا ہوں کہ اس مینارۂ نور سے ہدایت حاصل کروں، کچھ قرار پاؤں تو نئے دن کی دہلیز پر قدم رکھوں۔میرے سامنے سورہ العنکبوت ہے اور نگاہ جس آیت پر ٹھہرتی ہے وہ میرے پورے وجود کو جھنجھوڑ

کر رکھ دیتی ہے:

”وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعَالِمُوْنَ“ (العنکبوت:43)

یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں“۔

میں سوچتا ہوں کہ یا اللہ جب تیری آیات کو، تیرے کلام کو، تیری مثالوں کو بھی بے علم نہیں سمجھ سکتے تو ہم بھلا کس علمیت کے ڈنکے بجارہے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ہم علم کا مفہوم ہی بھول چکے ہیں۔ میں لغت کھولتا ہوں ، ایک کے بعد دوسری ، دوسری کے بعد تیسری۔علم کا مطلب ملتا ہے ناواقف سے واقف ہونا۔اللہ کی کائنات میں پھیلی اس کی تخلیقات یعنی اس کی آیات، اس کی نشانیوں کو سمجھنا۔اس کام کے واسطے اس کی جانب سے عطا کردہ بہترین انعامات یعنی کان آنکھ اور ذہن کا استعمال کرنا تاکہ ان کا صحیح شکر ادا ہو۔ کفرانِ نعمت نہ ہو۔ میں اپنے گردوپیش سے سمع وبصر یعنی حواس کی مدد سے معلومات حاصل کرتا ہوں جس کا تجزیہ میرا ذہن کرتا ہے اور پھر نتائج اخذ کرتا ہے۔ان نتائج کا مجموعہ ہی علم ہے۔قرآن کریم بھی علم کی یہی تعریف بیان کرتا ہے کہ یہ سمع بصر اور فواد سے حاصل ہوتا ہے۔جو لوگ حواس اور دماغ سے کام نہیں لیتے قرآن مجید تو انھیں انسان ہی تسلیم نہیں کرتا:

”بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے، ان کے دل ہیں مگر ان سے وہ سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر ان سے وہ سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں ہیں“(الاعراف:179)

میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ یا اللہ علم کی یہ شکل تو ہمارے سامنے کسی نے رکھی ہی نہیں۔جبھی دل سے آواز آتی ہے غافل تو ”کسی“ پر منحصر ہی کیوں رہا۔اللہ

نے تو یہ قرآن تیرے لیے آسان بنایا تھا تو نے خود اس پر تفکّر کیوں نہ کیا۔ ہدایت کے سرچشمے سے تو خود ہی دور رہا۔ اللہ کے نزدیک تو ایسے لوگ ''بدترین جانور'' ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے:

''یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے''۔(الانفال:22)

جو لوگ عقل وفکر سے کام لیتے ہیں انھیں قرآن مجید صاحبِ دانش وبینش کہتا ہے:

''بیشک زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو صاحبِ دانش وبینش ہیں''۔ (آلِ عمران:190)

یہ صاحبِ دانش وبینش کون لوگ ہیں؟

''یہ لوگ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے (گویا ہر وقت) اللہ کو (قوانینِ قدرت کو) یاد رکھتے ہیں اور زمین وآسمانوں کی تخلیق میں غور وفکر (تحقیق) کرتے ہیں''۔(آلِ عمران:191)

اور جب اس غور وفکر اور تحقیق کے بعد ان پر اللہ کی ان آیات کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے، کائناتی راز اُن پر کھلتے ہیں، اللہ کی مسخر کردہ نعمتوں سے وہ واقف ہوجاتے ہیں تو بے اختیار بول اٹھتے ہیں:

''پروردگار تو نے یہ سب کچھ فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے''(آلِ عمران:191)

میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی، یقیناً اللہ نے یہ زمین اور آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ نہ تو فضول بنایا ہے نا بے مقصد۔ اس کی یہ تخلیقات فضول اس لیے نہیں ہیں کہ ان کو اُس نے ہمارے لیے مسخر کردیا ہے۔ تمام نعمتیں ہمارے لیے ہیں، یہ بے مقصد نہیں۔ کیونکہ یہ ایک طرف ہمارے لیے انعامات ہیں تو دوسری طرف آیات

یعنی اللہ کی طرف ہمیں متوجہ کرنے والی نشانیاں۔ اور اگر ہم نے ان کو اس انداز سے نہ سمجھا، نہ ان کا علمی احاطہ کیا (النّمل: 84) اور نہ عملاً شکر کیا تو یقیناً ہم جہنم کا شکار ہوں گے۔ لہٰذا اللہ کی تخلیقات کو سمجھنے والے ''عالم'' ہمہ وقت دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔ علم کی یہ حقیقت واضح ہونے پر میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرا تمام جسم واعضاء سُن ہوچکے تھے۔ دل خوف سے کانپ رہا تھا۔ یا اللہ میں نے جو ماہ وسال جہالت کی نذر کردیئے ان کا کیا ہوگا۔ میں تو علم کے نام پر یا تو کچھ فن اور ہنر سیکھ کر نوکری کی تلاش کرتا رہا یا علم کے نام پر کچھ کتابوں کو رٹتا رہا اور ثواب کا منتظر رہا۔ میرا بند ضبط ٹوٹ گیا اور میں بارگاہ ایزدی میں گر گیا۔ اے میرے پروردگار، ہم کب تک علم کی اس خود ساختہ تشریح وتعبیر کا شکار رہیں گے، خود کو اور اپنی قوم کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھیں گے۔ یا اللہ کیا یہ ''ثمناً قلیلاً'' کے عوض بیوپار تو نہیں۔ کیا یہ تجاہل عارفانہ ہے۔ کسی مصلحت کا تقاضا ہے یا اپنی کم مائیگی اور نااہلیت کے اعتراف سے گریز۔ اے میرے پروردگار مجھ کو اور میری قوم کو علم کی صحیح سمجھ دے۔ ہم علم کو ''دنیوی علم'' کا نام دے کر، اس سے کنارہ کش ہوچکے ہیں۔ قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹ کر طاق پر رکھ چکے ہیں کہ اس کو سمجھ کر ہدایت پالیتے۔ اے پروردگار ہم کب تک خوش فہمی کا شکار رہ کر ذلت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ تو ہمارے درمیان ایسے راہبر، ایسے عالم پیدا کردے جو ہمیں علم کی مکمل حقیقت سمجھائیں۔ ہمیں علم کی باطل تقسیم سے نکالیں تاکہ ہم تیری کائنات اور اس میں پھیلی تیری آیات کو سمجھ سکیں اور ان قوموں میں شامل ہوجائیں جن پر تو نے ان کے علم کی بدولت اپنی آیات کھول دی ہیں۔ یا اللہ کیا ہمارے مقدر میں ایسی صبح، ایسا نیا سال ہے؟

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی) کے پرنسپل ہیں۔ آپ کے تدریسی شغل کا آغاز 1977ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوا، جہاں سے آپ نے 1979ء میں نباتات میں ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کی۔ موصوف گزشتہ بیس سالوں سے مسلمانوں میں سائنس اور سائنسی اندازِ فکر کے فروغ کے لئے بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی تمام تر توجہ قرآنِ کریم کو علوم کی مدد سے سمجھنے اور اسکے پیغام کو عام کرنے پر ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ سائنس یعنی علم کی مدد سے قرآنی اور کائناتی آیات کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے، نیز ہدایت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس اندازِ فکر کو عام کرنے کے واسطے آپ فروری 1994ء سے ایک عام فہم سائنسی ماہنامہ ''سائنس'' نکال رہے ہیں جو کہ اردو عوام اور طلبا میں یکساں مقبول ہے۔ آپ 400 سے زائد سائنسی مضامین تقاریر قلم بند کر چکے ہیں۔ سائنسی مضامین پر مشتمل تین مجموعے ''سائنس کی باتیں''، ''سائنس پارے'' اور ''سائنس نامہ'' کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ قرآن اور علم کے رشتے کو اُجاگر کرنے والی آپ کی تازہ ترین تصنیف ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر پرویز کے سائنسی مضامین مختلف ریاستوں کی نصابی کتب میں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر پرویز ''اسلامی فاؤنڈیشن برائے سائنس و ماحولیات'' کے بانی ڈائرکٹر ہیں اور اسی پلیٹ فارم سے انگریزی داں طبقے تک اللہ کا پیغام علمی و عقلی انداز میں پہنچا رہے ہیں۔ آپ کے مضامین بیرونی ممالک کی کتب میں بھی شائع ہوتے ہیں نیز وہاں کی یونیورسٹیاں اور ادارے اور تنظیمیں جن میں ہارورڈ، ییل (YALE) اور ٹورنٹو یونیورسٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں آپ کو خطاب و مذاکرات کے لئے بلاتی ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) سے چھپی کتاب 'اسلام اور ایکولوجی'' میں آپ کا ایک مضمون ''سائنسی جدتیں اور المیز ان'' شائع ہوا ہے۔ لندن کے کنٹینیوم (Continuum) پبلشر کے ذریعے شائع ہونے والے انسائکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ نیچر میں ڈاکٹر پرویز کے تین مضامین شامل ہیں جو اسلام میں انسان اور قدرتی وسائل کی حیثیت کا مختلف زاویوں سے احاطہ کرتے ہیں۔ آپ اردن، اسپین، امریکہ، بلجیم، انڈونیشیا، برطانیہ، جیم، ترکی، سعودی عرب، سنگاپور، فرانس، کناڈا، کویت، متحدہ عرب امارات، مراکش، ملیشیا، نیپال اور ہالینڈ کا سفر کر چکے ہیں۔

ISBN
81-902182-0-4